تدبرِ قرآن

۴۳

الزّخرف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ، سابق سورہ کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس وجہ سے دونوں کے عمود میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ گروپ کی دوسری سورتوں کی طرح اس کا بھی مرکزی مضمون توحید ہی ہے اور اس توحید ہی کی اہمیت واضح کرنے کے لیے اس میں قیامت کا بھی ذکر ہوا ہے۔ خاص طور پر ملائکہ کی الوہیت اور ان کی شفاعت کے تصور کا ابطال اس میں تفصیل سے ہے اور قریش کے اس دعوے کی تردید کی گئی ہے کہ وہ جس دینِ شرک کے پیرو ہیں یہ ان کو حضرت ابراہیمؑ سے وراثت میں ملا ہے۔

سابق سورہ میں قرآن کی عظمت ایک خاص پہلو سے نمایاں کی گئی تھی اس میں اس کے بعض دوسرے پہلو نمایاں کر کے قریش کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اگر محض دولتِ دنیا کے غرور میں تم نے اس عظیم نعمت کی قدر نہ کی تو یاد رکھو کہ پیغمبر کے اوپر ذمہ داری صرف اس حق کو پہنچا دینے کی ہے۔ اس کی تکذیب کے نتائج کی ذمہ داری خود تمھارے اوپر ہو گی۔

قرآن پر نفسِ وحی کے پہلو سے مخالفین کے جو اعتراضات تھے اور جن کو وہ اس کی تکذیب کا بہانہ بنا رہے تھے ان کے جواب پچھلی سورہ میں دیے گئے ہیں اس سورہ میں انبیائے سابقین کی دعوت کے ساتھ اس کی ہم آہنگی واضح فرمائی گئی ہے کہ جس دینِ توحید کی دعوت یہ قرآن دے رہا ہے اسی کی دعوت تمام انبیا نے دی ہے۔ جو لوگ اس کو جھٹلا رہے ہیں وہ اپنے لیے اسی ہلاکت کا سامان کر رہے ہیں جس سے رسولوں کی تکذیب کرنے والی دوسری قومیں دوچار ہوئیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۸) قرآن کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے قومِ عرب پر جو احسان فرمایا اور اس کے ذریعہ سے ان پر اتمامِ حجت کا جو سامان کیا اس کا حوالہ اور اس بات کی یاددہانی کہ اگر انھوں نے بھی اپنے رسول کی تکذیب کی وہی روش اختیار کی، جو ان سے پہلے کی قوموں نے اختیار کی تو اسی انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہیں جس سے وہ دوچار ہوئیں اور یاد رکھیں کہ قوت و شوکت کے اعتبار سے وہ ان سے کہیں

بڑھ چڑھ کر کھتیں۔

(۹ - ۱۵) مخالفین کے اس اعتراف کا حوالہ کہ آسمان و زمین کا خالق خدائے عزیز و علیم ہی ہے۔ لیکن اس اعتراف کے باوجود انھوں نے خدا کے بندوں میں سے اس کے شریک بنا رکھے ہیں حالانکہ اس کائنات میں قدرت، ربوبیت اور حکمت کے جو آثار و شواہد ہر قدم پر موجود ہیں وہ خدا کی توحید اور قیامت پر گواہ ہیں۔

(۱۶ - ۲۵) ملائکہ کی الوہیت کے تصوّر کا ابطال دو مختلف پہلوؤں سے۔

ایک اس پہلو سے کہ یہ لوگ ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں مانتے ہیں۔ درآنحالیکہ خود اپنے لیے بیٹیاں پسند نہیں کرتے۔ایک چیز کو اپنے لیے پسند نہ کرنا اور اس کو خدا کی طرف منسوب کرنا صریح حماقت اور ربّ عزیز و جلیل کی اہانت ہے۔

دوسرے اس پہلو سے کہ ملائکہ کو شریکِ خدا قرار دینے کی واحد دلیل ان کے پاس یہ ہے کہ ان کے باپ دادا ان کو شریکِ خدا مانتے رہے ہیں۔حالانکہ کسی طریقہ کی صحت و صداقت کی یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ طریقہ ان کو اپنے باپ دادا سے ملا ہے۔ یا تو وہ اللہ کی کسی کتاب کی سند پیش کریں یا عقل و فطرت سے کوئی دلیل لائیں ورنہ اسی انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہیں جس سے وہ قومیں دوچار ہوئیں جنھوں نے اس قسم کے لاطائل بہانوں کی آڑ لے کر اپنے رسولوں کی تکذیب کی۔

(۲۶ - ۲۸) تاریخ کی روشنی میں مشرکین کے اس دعوے کی تردید کہ یہ دینِ شرک ان کے باپ دادا کی وراثت ہے۔ان کے اصل جدّامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جنھوں نے اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ (میں ان چیزوں سے بری ہوں جن کو تم پوجتے ہو) کا یادگار کلمہ کہہ کر اپنی قوم کو چھوڑا اور اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مکّہ میں بسایا۔ان کا یہ اعلانِ ہجرت ایک مقدّس روایت کی حیثیت سے ان کی ذرّیت میں باقی رہا تو یہ کہنے کے کیا معنی کہ یہ شرک ان کے باپ دادا کی وراثت ہے!

(۲۹ - ۴۵) مکذبین کی سرکشی کے اصل سبب کا بیان کہ یہ اپنی جہالت کے حق میں جو دلیلیں گھڑنے کی کوشش کر رہے ہیں یہ محض سخن سازی ہے۔ اصل چیز جو ان کے لیے فتنہ بنی ہوئی ہے وہ ان کی دنیوی رفاہیت ہے حالانکہ خدا کی میزان میں اس رفاہیت کا کوئی وزن نہیں ہے۔ اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے اور یہ اس سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں۔شیطان نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے اور یہ پٹی ان کی اس وقت کھلے گی جب اس کا کھلنا اور نہ کھلنا دونوں ہی بے سود ہوگا۔پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ تم اپنی دعوتِ حق پر جمے رہو۔ہم ان کا انجام یا تو تمھاری زندگی ہی میں دکھا دیں گے یا تمھارے بعد یہ اس سے دوچار ہوں گے۔ تم جس دین کی دعوت دے رہے ہو وہ دینِ حق یہی ہے، تمام انبیاء کی شہادت اسی کے حق میں ہے۔

(۴۶ - ۶۵) حضرات انبیاء علیہم السلام میں سے دو نبیوں ــــ حضرت موسیٰؑ و حضرت عیسیٰؑ ــــ

کی دعوت کا حوالہ کہ انھوں نے بھی بعینہٖ اسی دینِ توحید کی دعوت دی۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنی رسالت کے حق میں، فرعون اور اس کے اعیان کو ایک سے ایک بڑھ کر نشانیاں دکھائیں لیکن وہ کسی نشانی سے بھی قائل نہ ہوئے۔ ان کی تکذیب کا سبب بعینہٖ یہی تھا جو قریش کے ان فراعنہ کی تکذیب کا ہے۔ بالآخر وہ کیفرِ کردار کو پہنچے، وہی انجام ان لوگوں کا بھی ہونا ہے۔

اسی توحید کی دعوت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی دی۔ ان کا نام سنتے ہی قریش کے جھگڑالو تم سے مناظرہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں کہ ان سے بہتر تو ہمارے ہی معبود ہیں گویا ان جاہلوں کے نزدیک قرآن ان کا ذکرِ خیر اس لیے کر رہا ہے کہ لوگ نصاریٰ کی طرح ان کو ابن اللہ مانیں حالانکہ قرآن ان کو ابنُ اللہ کی حیثیت سے نہیں پیش کر رہا ہے بلکہ اس حیثیت سے پیش کر رہا ہے کہ ان کی دعوت اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ (اللہ ہی میرا بھی رب ہے اور وہی تمھارا بھی رب ہے تو اسی کی بندگی کرو) کی دعوت تھی۔ ان کی اس دعوتِ حق میں اختلافات تو بعد والوں نے پیدا کیے ہیں اور وہ عنقریب اس کا انجام دیکھیں گے۔

(۶۶ - ۸۹) خاتمہ سورہ جس میں پہلے ان لوگوں کا انجام بیان ہوا ہے جو اس دعوتِ حق پر ایمان لائیں گے۔ پھر ان لوگوں کا انجام بیان ہوا ہے جو اس کی تکذیب کریں گے۔ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ ان ضدی لوگوں سے اعراض کرو۔ یہ خود اپنا انجام دیکھ لیں گے اور فرشتوں کی جس شفاعت کے بل پر یہ اکڑ رہے ہیں اس کی حقیقت ان کے سامنے آجائے گی۔

اس تجزیۂ مطالب پر ایک نظر ڈال کر دیکھ لیجیے کہ عمود کے ساتھ اس کے ہر جزو کا کیسا گہرا تعلق اور شروع سے لے کر آخر تک یہ پوری سورہ کس طرح مربوط ہے۔ اب ہم اللہ کا نام لے کر سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں وبیدہ التوفیق۔

سُوْرَةُ الزُّخْرُفِ (۴۳)

مَكِّيَّةٌ —— آیات : ۸۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۲۵

حٰمٓ ﴿۱﴾ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۲﴾ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا
لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۳﴾ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿۴﴾
اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ ﴿۵﴾
وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶﴾ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ
نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۷﴾ فَاَهْلَكْنَآ اَشَدَّ مِنْهُمْ
بَطْشًا وَّمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۸﴾ وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ
خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿۹﴾
الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا
لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰﴾ وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ
بِقَدَرٍ ۚ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۱﴾
وَالَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ
وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ﴿۱۲﴾ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا
نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ

سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰكُمْ بِالْبَنِيْنَ ﴿۱۶﴾ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۱۷﴾ اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِى الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِى الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ﴿۱۸﴾ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْئَلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۗ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ﴿۲۱﴾ بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿۲۳﴾ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۲۴﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۵﴾

ع ۱۵ ا

ع ۲ ۸

ترجمہ آیات ۱-۲۵: یہ ختم ہے۔ شاہد ہے یہ واضح کتاب۔ ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اتارا

ہے تاکہ تم سمجھو۔ اور بے شک یہ اصل کتاب میں ہمارے پاس ہے نہایت بلند اور پُر حکمت۔ ۱-۴

کیا ہم تمہاری تذکیر سے اس لیے صرفِ نظر کرلیں کہ تم حدود سے تجاوز کر جانے والے لوگ ہو! اور ہم نے اگلوں میں کتنے ہی نبی بھیجے اور جو نبی بھی ان کے پاس آتا تو وہ اس کا مذاق ہی اڑاتے۔ تو ہم نے ان سے زیادہ زور آوروں کو ہلاک کر چھوڑا اور اگلوں کی مثالیں گزر چکی ہیں۔ ۵-۸

اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ لازماً یہی جواب دیں گے کہ ان کو خدائے عزیز و علیم نے پیدا کیا ہے۔ ۹

جس نے تمہارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا اور اس میں تمہارے لیے راستے رکھے کہ تم راہ پاؤ۔ اور جس نے آسمان سے پانی اتارا ایک اندازہ کے ساتھ۔ پس ہم نے اس سے حیاتِ تازہ بخش دی ایک مردہ زمین کو۔ اسی طرح تم بھی قبروں سے نکالے جاؤ گے! اور جس نے تمام گوناگوں قسم کی چیزیں پیدا کیں اور تمہارے واسطے وہ کشتیاں اور چوپائے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو تاکہ تم ان کی پیٹھوں پر جم کر بیٹھو پھر تم اپنے رب کی نعمت کو، جب کہ تم ان پر بیٹھو، یاد کرو اور کہو کہ پاک ہے وہ ذات جس نے ان چیزوں کو ہماری خدمت میں لگا دیا اور ہم تو ان کو قابو میں کر لینے والے نہیں تھے! اور بے شک ہم اپنے رب ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں! ۱۰-۱۴

اور ان لوگوں نے اس کے بندوں میں سے اس کا ایک جزء ٹھہرایا۔ بے شک انسان کھلا ہوا ناشکرا ہے! کیا اس نے اپنی مخلوقات میں سے اپنے لیے بیٹیاں

پسند کیں اور تم کو بیٹوں سے نوازا! اور جب ان میں سے کسی کو اس چیز کی بشارت دی جاتی ہے جس کو وہ خدا کی صفت بیان کرتا ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ گھٹا گھٹا رہنے لگتا ہے کہ کیا وہ پیدا ہوئی ہے جو زیوروں میں پلتی اور مناقشات میں بے زبان ہے! ۱۵-۱۸

اور انھوں نے فرشتوں کو جو خدائے رحمان کے بندے ہیں، بیٹیوں کا درجہ دے رکھا ہے۔ کیا یہ ان کی ولادت کے وقت موجود تھے! ان کی یہ گواہی نوٹ رہے گی اور ان سے اس کی پرسش ہوگی! ۱۹

اور کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم ان کو پوجنے والے نہ بنتے۔ ان کو اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ یہ محض اٹکل کے تیر چلا رہے ہیں۔ کیا ہم نے ان کو اس سے پہلے کوئی کتاب دی ہے تو وہ اس کی سند پکڑتے ہیں! بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم بھی انہی کے نقشِ قدم پر راہ یاب ہیں۔ اور اسی طرح ہم نے جس بستی میں بھی تم سے پہلے کوئی منذر بھیجا تو اس کے خوش حالوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقشِ قدم پر چلتے رہیں گے۔ منذر نے کہا، کیا اگر میں اس سے زیادہ ہدایت بخش طریقہ لے کر تمھارے پاس آیا ہوں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے جب بھی تم انہی کے نقشِ قدم کی پیروی کرو گے! انھوں نے جواب دیا کہ ہم اس سارے کے منکر ہیں جو دے کر تم بھیجے گئے ہو! تو ہم نے ان سے انتقام لیا تو دیکھو کیسا انجام ہوا جھٹلانے والوں کا! ۲۰-۲۵

۱۰۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حٰمٓ (۱)

پہلی سورتوں کی طرح اس کا قرآنی نام بھی 'حٰمٓ' ہی ہے۔ سورتوں کے ناموں کا اشتراک، ہم اشارہ کر چکے ہیں، ان کے مطالب کے اشتراک پر دلیل ہے۔ چنانچہ تمام 'حوامیم' جو آپ پڑھتے آ رہے ہیں، ایک ہی قدرِ مشترک کی حامل ہیں۔ اختلاف اگر ہے تو اسلوبِ بیان، نہجِ استدلال اور اجمال و تفصیل کا ہے۔

وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ (۲)

قرآن اپنے ہر دعوے پر خود حجت ہے

یہ قرآن کی قسم کھائی ہے اور اس کی صفت یہاں 'مُبِیْن' وارد ہوئی ہے جس کے معنی ہیں واضح کر دینے والی کتاب، یعنی اپنے ہر دعوے پر یہ خود حجت ہے، کسی خارجی دلیل کی محتاج نہیں ہے۔ جو لوگ اس کی تکذیب کے لیے بہانے ڈھونڈھ رہے ہیں وہ آفتاب پر خاک ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں بلکہ خود اپنی ہی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

یہاں مُقسم علیہ محذوف ہے۔ جہاں قرینہ بالکل واضح اور قسم خود مقسم علیہ کو واضح کر رہی ہو، وہاں مقسم علیہ کو حذف کر دیتے ہیں۔ اس کی متعدد مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں۔ سورۂ 'ق' میں بھی اس کی نہایت واضح مثال موجود ہے۔ یہاں لفظ 'مُبِیْن' نے خود مُقسم علیہ کی طرف اشارہ کر دیا ہے اس وجہ سے اس کے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ گویا آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔

اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۳)

قرآن کے مبین ہونے کا ایک خاص پہلو

یہ قرآن کے 'مُبِیْن' ہونے کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ہم نے اس کو عربی قرآن کی صورت میں اتارا ہے تاکہ تم سمجھو۔ یہ مضمون اس گروپ کی پچھلی سورتوں میں بھی مختلف اسلوبوں سے گزر چکا ہے اور ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ قرآن کا عربی میں اتارا جانا اہلِ عرب پر ایک عظیم احسان بھی تھا اور ایک فیصلہ کن اتمامِ حجت بھی۔ احسان کا پہلو تو بالکل واضح ہے کہ خدا نے اپنی آخری اور کامل ہدایت ان کی زبان میں اتاری کہ وہ بلا واسطہ غیر اس سے کسبِ فیض کر سکیں، دوسروں کی تعلیم و تبلیغ کا انھیں رہینِ احسان نہ ہونا پڑے بلکہ دوسرے ان کے ممنونِ احسان بنیں۔ اتمامِ حجت کا پہلو یہ ہے کہ اللہ نے ان کی اپنی زبان میں اپنی ہدایت نازل کر کے ان کا ہر عذر ختم کر دیا ہے اب وہ عند اللہ یہ عذر نہیں کر سکتے کہ مخاطب عربی اور کلام عجمی!

وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ (۴)

قرآن کی عالی نسبی

اس قرآن کی عظمت واضح فرمائی کہ یہ کوئی ہنسی مسخری کی چیز نہیں ہے بلکہ نہایت ہی عالی نسب

اور عالی مقام چیز ہے۔ اس کی عالی نسبی کی وضاحت یوں فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے پاس جو 'اُمُّ الکتٰب'
یعنی لوحِ محفوظ ہے یہ اس میں ہے اور اسی میں سے یہ تمہاری ہدایت کے لیے نازل کیا گیا ہے۔
مطلب یہ ہے کہ کوئی اس کو جنّات کا القاء، کاہنوں کی کہانت، شاعروں کی شاعری اور خطیبوں کی
لفّاظی گمان کر کے، اس کا مذاق اڑانے کی کوشش نہ کرے بلکہ یہ روشنی اس منبعِ نور سے نازل ہوئی
ہے جس کے نور ہی سے آسمان و زمین میں روشنی ہے اور جو تمام علم کا حقیقی سرچشمہ ہے۔ بدقسمت
ہوں گے وہ لوگ جو اس کی قدر نہ پہچانیں!

قرآن کی عالی مقامی

اس کی عالی مقامی کا اظہار یوں فرمایا کہ 'لَعَلِیٌّ حَکِیْمٌ' یہ قرآن بجائے خود نہایت برتر اور
پرحکمت ہے۔ یاد ہوگا، پچھلی سورہ میں بعینہٖ یہی صفت آیت ۵۱ میں اللہ تعالیٰ کے لیے آئی ہے
اور وحی و قرآن کے بیان ہی کے سلسلے میں آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر کلام متکلم کی صفات و خصوصیات
کا آئینہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ 'علیٌّ و حکیم' ہے اس وجہ سے اس کا کلام بھی 'علیٌّ و حکیم' ہے۔
اس سے یہ اشارہ نکلا کہ جن کے اندر جوہر شناسی کی صلاحیت ہوگی وہ اس کلام کی قدر کریں گے،
رہے بلید و بدذوق لوگ تو نہ وہ اس کے اہل ہیں نہ وہ اس کی قدر کریں گے۔

اس کی عالی مقامی کے ذکر سے مخالفین کو اس حقیقت کی طرف بھی توجہ دلا دی گئی کہ یہ آسمانوں
اور زمین کے خالق کا اتارا ہوا کلام ہے، کسی سائل کی درخواست نہیں ہے۔ اگر تم نے اس کی قدر
نہ کی تو تم اپنے ہی کو محروم کرو گے، خدا یا اس کے کلام کا کچھ نہیں بگاڑو گے۔ ان کی عظمت اور برتری
اپنی ذاتی ہے جو دوسروں کے ردّ و قبول سے بالکل بے نیاز ہے۔

اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ (۵)

تمہاری ناقدری کے باوجود تم پر اتمامِ حجت ضروری ہے

یعنی ہرچند تم ہو تو ناشکرے اور ناقدرے کہ اس کلام بلند و برتر کی توہین و تکذیب کر رہے ہو
اور شرک و کفر میں مبتلا ہو کر اپنی جانوں پر جو ظلم تم نے ڈھائے ہیں ان کی اصلاح پر تمہاری طبیعتیں
آمادہ نہیں ہو رہی ہیں لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیا جاتا یا اب
چھوڑ دیا جائے، تمہاری بیماریوں اور ان کے مہلک نتائج سے تم کو اچھی طرح آگاہ نہ کیا جائے۔
تمہاری یہ حالت اغماض کے بجائے اس بات کی متقاضی ہے کہ تمہارا علاج کیا جائے چنانچہ اللہ
نے تمہاری تعلیم و تذکیر کے لیے اپنی کتاب اتاری۔ تم اس کی قدر کرو یا نہ کرو، لیکن یہ تذکیر اس
وقت تک جاری رہے گی جب تک تم پر اللہ کی حجّت تمام نہ ہو جائے تاکہ جس کو زندگی کی راہ
اختیار کرنی ہو وہ پوری بصیرت کے ساتھ زندگی کی راہ اختیار کرے اور جس کو ہلاکت کی راہ پر
جانا ہو وہ اتمامِ حجّت کے بعد اس راہ پر جائے۔ تمہاری یہ تذکیر و تنبیہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ
سنت کے مطابق ہو رہی ہے۔ تم کتنی ہی نفرت و رعونت کے ساتھ اس کو ٹھکراؤ لیکن اب یہ اپنے

آخری تاریخ تک پہنچ کے رہے گی۔

صَفْحًا میرے نزدیک مفعول لہٗ کے مفہوم میں ہے اور اس کے معنی چشم پوشی کے ہیں۔ ضرب عنہ الشیٔ کے معنی ہوں گے، اُس سے اس چیز کو ہٹا دیا۔ اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ ان کی اصل بیماری کا بیان ہے اور مسرفین یہاں اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ کے مفہوم میں ہے یعنی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے اور اپنی جانوں پر سب سے بڑا ظلم شرک ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب تم کفر و شرک کی آلودگیوں میں لتھڑے ہوئے ہو تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ تم سے اپنا جامِ شفا ہٹائے رکھتا۔ دوا کے اصل مستحق تو مریض ہی ہوتے ہیں، خواہ وہ اس کی قدر کریں یا نہ کریں۔ اگر اس کی قدر کرو گے تو اپنا بھلا کرو گے، اگر نہ کرو گے تو اپنی ہی موت کو دعوت دو گے۔

وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ فَاَهْلَكْنَآ اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَّمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ (۶-۸)

مذکورہ بات کی تائید ماضی کی تاریخ سے

یہ اوپر کی بات کی تائید ماضی کی تاریخ سے پیش کی گئی ہے اور خطاب بغرضِ تسلی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ فرمایا کہ جو سلوک آج تمھارے مخالفین تمھارے ساتھ کر رہے ہیں یہی سلوک اس سے پہلے دوسرے نبیوں کے ساتھ ان کی قومیں کر چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تم سے پہلے بھی کتنے رسول اسی مقصدِ تذکیر و اصلاح کے لیے بھیجے لیکن ہر قوم نے اپنے رسول کا مذاق اڑایا اور اس کی نصیحتوں کی تحقیر کی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کو تباہ کر دیا اور وہ قومیں کچھ کمزور نہ تھیں بلکہ وہ اپنی قوت و شوکت میں ان سے (قریش سے) کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں لیکن اللہ کے عذاب نے ان کی کمر توڑ کے رکھ دی۔ وَمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ اور تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ یہ اشارہ عاد و ثمود اور ان قوموں کی طرف ہے جن کی تباہی کی تفصیلات پچھلی سورتوں میں بھی بیان ہو چکی ہیں اور آگے کی سورتوں میں بھی آ رہی ہیں۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ (۹)

مشرکین کے تضادِ فکر کی وضاحت

یہ قریش کے کفر و شرک اور ان کی اس ضد و مکابرت کی تفصیل بیان ہو رہی ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۵ میں اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ کے الفاظ سے گزر چکا ہے۔ یہ بیان آگے دور تک جائے گا۔ فرمایا کہ یہ لوگ اپنے دینِ شرک کی حمایت میں تم سے لڑنے کے لیے آستینیں چڑھائے ہوئے ہیں لیکن یہ ایک شدید قسم کے تضادِ فکر میں مبتلا ہیں جس کی طرف ان کا جوشِ مخالفت ان کو متوجہ ہونے نہیں دے رہا ہے۔ اگر تم ان سے سوال کرو کہ آسمانوں اور زمین کا خالق کون ہے تو اس کا جواب لازماً وہ یہی دیں گے کہ ان کا خالق خدائے عزیز و علیم ہے لیکن دوسری طرف

ان کی سفاہت کا یہ عالم ہے کہ وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا (اور انھوں نے اللہ کے بندوں میں سے اس کے شریک اور کفو و ہمسر بنا رکھے ہیں) یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکین عرب جیسا کہ پچھلی سورتوں میں تفصیل گزر چکی ہے، آسمان و زمین اور دوسری تمام مخلوقات کا خالق اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے لیکن دوسری طرف وہ یہ بھی مانتے تھے کہ ملائکہ خدا کی بیٹیاں ہیں جو اس کی چہیتی اور اس کی ذات و صفات میں شریک ہیں اس وجہ سے ان کی عبادت، خدا کے تقرب کا ذریعہ اور مال و اولاد کی فراوانی کا وسیلہ ہے۔

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا وَجَعَلَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (۱۰)

چار آیتیں بطور تضمین

یہ آیت اور بعد کی تین آیات مشرکین کے جواب کا حصہ نہیں ہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور تضمین اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہیں کہ جو شخص اس کائنات کی خلقت پر تدبر کی نگاہ ڈالے گا وہ اس میں خالق کی قدرت، ربوبیت، اور حکمت کے ایسے آثار پائے گا کہ لازماً وہ اس کی توحید کا بھی اقرار کرے گا اور ایک روزِ جزا و سزا کا بھی۔ مقصد اس تفصیل سے یہ دکھانا ہے کہ مشرکین کا یہ اعتراف کہ آسمان و زمین کا خالق خدائے عزیز و علیم ہی ہے، اگر اپنی صحیح سمت میں آگے بڑھے تو اس کے تضمنات یہ بھی ہیں جو آگے بیان ہو رہے ہیں۔ لیکن مشرکین پہلا قدم صحیح اٹھا کر پھر غلط سمت میں مڑ جاتے ہیں جس سے وہ اپنے مانے ہوئے عقیدہ کو باطل اور پائی ہوئی راہ کو گم کر دیتے ہیں۔

خدا کے خالق ہونے کے تضمنات

فرمایا کہ وہی خدائے عزیز و علیم جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے (اور جس کا خالق ہونا تم کو بھی تسلیم ہے) اسی نے تمھاری بود و باش کے لیے اس زمین کو گہوارہ بنایا۔ اس گہوارہ بنانے کی مزید وضاحت قرآن کے دوسرے مقامات میں اس طرح فرمائی ہے کہ اس نے اپنی عظیم قدرت و حکمت سے اس میں پہاڑ گاڑ دیے ہیں کہ وہ تمھارے سمیت کسی طرف کو لڑھک نہ پڑے۔ پھر اس میں تمھارے لیے راستے رکھے ہیں یعنی زمین کے توازن کو قائم رکھنے کے لیے پہاڑ گاڑے تو اس طرح نہیں کہ وہ ہر طرف سے تمھاری راہ روک کر کھڑے ہو جائیں بلکہ خشکی اور تری دونوں کے اندر ان پہاڑوں کے درمیان سے تمھارے لیے راستے بھی رکھے ہیں کہ تمھارے قافلے اور تمھارے جہازات ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کر سکیں۔

ایک معنی خیز ٹکڑا

'لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ' کا ٹکڑا یہاں نہایت معنی خیز اور بلیغ ہے۔ ایک مطلب تو اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمین میں پہاڑوں کی فلک بوس دیواروں کے درمیان تمھارے لیے جو راستے رکھے ہیں وہ اس لیے رکھے ہیں کہ تم ان ناقابلِ عبور دیواروں کے اندر محبوس و محصور ہو کے نہ رہ جاؤ بلکہ ان سے باہر نکلنے کے لیے بھی راہیں کھلی رہیں۔ دوسرا نہایت لطیف اشارہ اس سے یہ نکلتا ہے کہ تم اپنے رب کی قدرت، حکمت، ربوبیت اور اپنے حال پر اس کی ان بے پایاں عنایات پر غور کرو اور اس نتیجہ

تک پہنچو کہ جس پروردگار نے تمھارے لیے یہ کچھ اہتمام فرمایا ہے۔ وہی تمھاری شکرگزاری اور عبادت و اطاعت کا اصل سزاوار ہے اور اگر تم نے اس کے اس حق کو نہ پہچانا تو ایک دن لازماً ایسا آئے گا جس میں تم کو اس ناسپاسی کی جواب دہی کرنی پڑے گی۔

وَالَّذِیْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ۚ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ (۱۱)

اندازۂ الٰہی کا کرشمۂ ربوبیت

اور اسی خدائے عزیز و علیم کا یہ کرشمۂ ربوبیت بھی ہے کہ اس نے آسمان سے پانی اتارا ایک خاص اندازے کے ساتھ۔ پانی کا ایک خاص اندازے کے ساتھ اترنا اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ یہ محض ابر و ہوا کے تصرّف سے نہیں بلکہ ایک عزیز و علیم کی تقدیر سے اترتا ہے جو اپنی حکمت کے تحت صرف اتنا ہی پانی اتارتا ہے جس کا زمین تحمل کر سکتی ہے۔ پھر اس سے یہ بات بھی نکلی کہ آسمان و زمین دونوں کے اندر ایک ہی خدائے عزیز و علیم کا ارادہ کارفرما ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ آسمان اور زمین میں ایسا توافق ہوتا کہ آسمان سے پانی اترتا اور زمین اس سے اپنی صلاحیتیں اجاگر کرتی۔ مزید برآں اس سے یہ بات بھی نکلی کہ وہ عزیز و علیم ہستی نہایت کریم و بندہ پرور ہے کہ ایک خاص اندازے کے ساتھ ہی پانی اتارتی ہے۔ اسی اندازے کے ساتھ زمین کی تمام برکتیں وابستہ ہیں۔ اگر اس میں کوئی خلل واقع ہو جائے تو یہ زمین پانی کی کمی سے بھی تباہ ہو سکتی ہے اور اس کی زیادتی سے بھی۔

بارش کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ

فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ۔ یہ بارش کے ایک اور خاص پہلو کی طرف توجہ دلائی اور یہ پہلو چونکہ اس کائنات کی ایک بہت بڑی حقیقت کو آشکارا کرنے والا ہے اس وجہ سے اس کا ذکر متکلم کے صیغے سے فرمایا جو اہتمام خاص پر دلیل ہے۔ فرمایا کہ دیکھتے ہو کہ اسی پانی سے ہم ایک مردہ اور بے آب و گیاہ زمین کو زندہ کر دیتے ہیں اور وہ لہلہا اٹھتی ہے۔ اسی طرح ایک دن تم بھی مرنے اور گل سڑ جانے کے بعد اس زمین سے اٹھا کھڑے کیے جاؤ گے۔

وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ۝ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ۝ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ (۱۲-۱۴)

بعض اور آثار قدرت کی طرف اشارہ

اسی خدائے عزیز و علیم کی پروردگاری کے بعض اور آثار کا ذکر کر کے ان کے مقتضیات کی طرف توجہ دلائی جن کا احساس ہر سلیم الفطرت انسان کے اندر پیدا ہونا چاہیے جو ان سے بہرہ مند ہو رہا ہے۔

فرمایا کہ وہی خدا ہے جس نے تمہارے لیے دوسری نوع بنوع چیزیں پیدا کی ہیں۔ لفظ اَزْوَاجَ یہاں گوناگون اور نوع بنوع چیزوں کے مفہوم میں ہے۔ اسی معنی میں یہ لفظ قرآن مجید اور عربی ادب میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ کے الفاظ سے بھی قرآن میں یہی مفہوم ادا فرمایا گیا ہے۔ اشیاء اور انواع کی گوناگونی اور ان کا جوڑے جوڑے ہونا اس کائنات میں اسی لیے ہے کہ انسان کو اس کائنات کے خالق کی قدرت و حکمت اور اس کی رحمت و ربوبیت کی یاددہانی ہوتی رہے۔ جوڑوں کے اندر جو توافق پایا جاتا ہے اس سے قرآن نے توحید پر جو دلیل قائم فرمائی ہے اس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

وَجَعَلَ لَكُم مِّنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ۔ یہ عام کے بعد دو خاص چیزوں کا ذکر فرمایا کہ وہی خدا ہے جس نے تمہارے لیے کشتیاں اور ایسے چوپائے پیدا کیے جن پر تم سوار ہوتے ہو۔ قرآن کے زمانۂ نزول میں خشکی اور تری کی یہی سواریاں معروف تھیں اس وجہ سے انہی کا ذکر ہوا۔ اب سائنس کی برکت سے ان سواریوں کی فہرست گو بہت طویل ہو گئی ہے لیکن وہ سب انہی کے تحت ہیں اس لیے کہ جس سائنس کی مدد سے انسان ان کا موجد بنا ہے وہ خدا ہی کی ودیعت کردہ ہے۔

نعمتوں کا حق

لِتَسْتَوُوا عَلَىٰ ظُهُورِهِ ...... الآیۃ۔ یہ ان نعمتوں کا حق بیان ہو رہا ہے کہ خدا نے یہ سواریاں تمھیں اس لیے دی ہیں کہ تم ان سے فائدہ اٹھاؤ اور ان کے بخشنے والے کا حق پہچانو اور جب تم ان کی پیٹھوں پر بیٹھو تو اپنے رب کے اس فضل کو یاد کرو کہ اس نے بغیر کسی استحقاق کے یہ نعمتیں تم کو بخشی ہیں اس وجہ سے تمہارے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ تم ان پر سوار ہو کر اپنے غرور کا مظاہرہ کرو بلکہ اس وقت تمھیں یہ دعا کرنی چاہیے کہ پاک ہے وہ ذات جس نے ہماری مقصد برآری کے لیے ان کو ہمارے قابو میں کر دیا ہے ورنہ ہم تو ان کو قابو میں کرنے والے نہیں بن سکتے تھے۔

لِتَسْتَوُوا عَلَىٰ ظُهُورِهِ، میں لفظ ظُهُور اگرچہ کشتیوں کے لیے زیادہ موزوں نہیں ہے، اس کی واضح مناسبت گھوڑوں یا سواری کے دوسرے جانوروں ہی کے ساتھ ہے، لیکن یہاں یہ لفظ علی سبیل التغلیب استعمال ہوا ہے۔ اس طرح کا استعمال عربی میں معروف ہے۔ مقصود یہی کہنا ہے کہ کشتی پر سوار ہو یا گھوڑے پر اس وقت غرور سے اکڑنے کے بجائے اپنے رب کی نعمت کا شکر ادا کرو لیکن خاص طور پر گھوڑوں کے ذکر کے ساتھ یہ تنبیہ اس لیے فرمائی کہ گھوڑے کا سوار عام پیدل چلنے والوں کے سامنے سے گزرتا ہے اس وجہ سے اس کے اندر اپنے تفوق کا احساس (خاص طور پر جب کہ وہ تنگ ظرف بھی ہو) زیادہ شدت کے ساتھ ابھرتا ہے یہاں تک کہ گھوڑے

کی طرح خود اس کی گردن بھی اکڑ جاتی ہے۔ یہی چیز اس زمانے میں موٹروں نے کہیں زیادہ بڑھادی ہے۔ بہت کم خوش قسمت ایسے ہوتے ہیں جو موٹریں بھلے آدمیوں کی طرح بیٹھیں۔ ان کی رعونت ان کی ہر ادا سے نمایاں ہوتی ہے اور اس قدر بدنما طریقے سے نمایاں ہوتی ہے کہ یہ امتیاز مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ آدمی ہی ہیں یا کوئی اور مخلوق!

'سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ'۔ 'سُبْحٰنَ اللّٰہ' تعالیٰ کی تنزیہہ کا کلمہ ہے یعنی وہ ہر قسم کے شرک اور ہر چھوٹے بڑے عیب سے پاک ہے۔ یہ تنزیہہ آدمی کے اندر خدا ہی کے لیے تفویض و تسلیم کا جذبہ ابھارتی ہے اور یہی جذبہ انسان کو غرور و استکبار اور طغیان و فساد سے بچاتا اور اس کے اندر شکر و سپاس کی نیازمندی و فروتنی پیدا کرتا ہے۔

'اِقْرَانٌ' کے معنی اپنے حریف پر غلبہ پانے اور اس کو مطیع کر لینے کے ہیں۔ یعنی اس وقت انسان کو پوری نیازمندی کے ساتھ اپنے رب کے حضور میں یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ یہ اللہ ہی کی شان اور اسی کا فضل و کرم ہے کہ اس نے اس مرکب کو ہمارا مطیع و فرماں بردار بنا دیا ہے ورنہ ہم تو اس کو قابو میں کر لینے والے نہیں بن سکتے تھے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ اعتراف ایک حقیقتِ نفس الامری کا اعتراف ہے۔ اس دنیا میں جو چیزیں بھی ہماری خدمت گزاری میں لگی ہوئی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی تسخیر ہی سے لگی ہوئی ہیں۔ یہ تسخیر نہ ہو تو مجرد ہماری تدبیر کسی چھوٹی سے چھوٹی چیز پر بھی کمند نہیں ڈال سکتی۔ اونٹ جیسے بڑے جانور کی ناک میں آپ نکیل ڈال دیتے ہیں اور گھوڑے کے منہ میں لگام لگا دیتے ہیں۔ یہی کام اگر آپ جنگل کے درندوں کے ساتھ کرنا چاہیں تو ہزار خطرات کا مقابلہ کرنے کے بعد بھی آپ شیر پر سواری نہیں کر سکتے۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی مہربانی ہے کہ اس نے ہماری خدمت کے لیے مختلف قسم کے جانور پیدا کیے اور ہمیں یہ صلاحیت بخشی کہ ہم ان کو مسخر کر کے اپنے مختلف مقاصد میں استعمال کرتے ہیں۔ اس زمانے میں بھاپ، بجلی اور ایٹم پر انسان کو جو تصرف حاصل ہوا ہے وہ بھی خدا ہی کی تسخیر سے حاصل ہوا ہے۔ ان فتوحات نے انسان کو بہت مغرور بنا دیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اب کون و مکان کا مالک سمجھنے لگا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ جب چاہے ان کو انسان کی قید سے آزاد کر کے رحمت کے بجائے عذاب بنا دے۔

یہاں جو دعا تلقین کی گئی ہے اس کا ظاہری تعلق تو اونٹ اور گھوڑے وغیرہ کی سواریوں ہی سے ہے لیکن یہی دعا اس زمانے کی دوسری ترقی یافتہ سواریوں کے لیے بھی موزوں ہے۔ مثلاً موٹر اور ہوائی جہاز وغیرہ۔ البتہ بحری سواریوں کے لیے موزوں تر دعا 'بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا' والی دعا ہے جو حضرت نوحؑ سے منقول ہے۔

ایک بلیغ نقرہ

وَإِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا لَمُنقَلِبُونَ ؛ اور جس طرح آیت ۱۰ میں لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ کے الفاظ نہایت معنی خیز گزرے ہیں اسی طرح یہاں یہ الفاظ بھی نہایت بلیغ، حقیقت، افروز اور فلسفہ دین کی ایک نہایت اہم حقیقت پر روشنی ڈالنے والے ہیں۔ یعنی انسان کو کسی سواری پر بیٹھتے ہوئے صرف اتنی سی بات یاد نہیں رکھنی چاہیے کہ ہم فلاں شہر سے فلاں شہر کو جانے والے ہیں بلکہ اس حقیقت کا بھی تذکر کرنا چاہیے کہ ایک دن ہمیں لازماً اپنے رب کی طرف لوٹنا اور اس کے آگے پیش ہونا ہے۔ اس تذکر کا محرک یہ ہے کہ ہر نعمت خدا کی پروردگاری کی شہادت ہے اور پروردگاری اس بات کو مستلزم ہے کہ پروردگار ایک دن سب کو جمع کرکے ان سے پرسش کرے کہ انھوں نے اس کی بخشی ہوئی نعمتوں کو کس طرح استعمال کیا۔ پھر ان کو انعام دے جنھوں نے ان کو صحیح استعمال کیا ہو اور ان سے انتقام لے جنھوں نے ان کو طغیان و فساد کا ذریعہ بنایا۔ یہ مسئولیت اور جزا و سزا اس ربوبیت کا لازمی تقاضا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو یہ تمام ربوبیت بے معنی اور یہ دنیا کھلنڈرے کا کھیل بن کے رہ جاتی ہے۔ یہ ایک حقیقت سے دوسری اعلیٰ حقیقت کی طرف گریز کی ایک نہایت خوب صورت مثال ہے جس کے متعدد شواہد اس کتاب میں پیچھے گزر چکے ہیں۔

وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا ۚ إِنَّ الْإِنسَانَ لَكَفُورٌ مُّبِينٌ (۱۵)

مشرکین کے فکری تضادات پر تبصرہ

اس آیت کا تعلق اوپر کی آیت ۹ (وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ ..... الآیۃ) سے ہے۔ وہاں اس کے بعد تضمین کی آیتیں آ گئی تھیں اس وجہ سے ان تضادات پر کوئی تبصرہ نہیں ہوا تھا جو اعتراف کرنے والوں نے اپنے اندر جمع کر لیے تھے۔ اب یہ ان تضادات پر تبصرہ ہو رہا ہے۔ گویا پوری بات یوں ہے کہ ایک طرف تو ان لوگوں کا اقرار یہ ہے کہ آسمان و زمین کا خالق خدا ہی ہے، دوسری طرف انھوں نے خدا کے بندوں میں سے کچھ کو خدا کا جزو یعنی شریک ذات بنا رکھا ہے۔ ان کا یہ عقیدہ ان کے اپنے مسلّمہ کے خلاف ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ہی تمام آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کا خالق ہے تو ہر چیز اسی کی مخلوق ہوئی، پھر کوئی چیز اس کا جزو کیسے ہو سکتی ہے! کسی چیز کے اس کا جزو ہونے کے معنی تو یہ ہوئے کہ وہ اس کی ذات کے اندر سے وجود میں آئی ہو اور پھر اس کا لازمی اقتضا یہ بھی ہے کہ وہ اس کی کفو اور ہمسر بھی ہو۔ اس بات کے ماننے کے بعد خدا کی یکتائی اور بے ہمگی کہاں باقی رہی! یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکین کے دیویوں دیوتاؤں میں کچھ تو وہ تھے جن کو وہ صرف خدا کی صفات، یا اس کے حقوق میں شریک مانتے تھے اور کچھ ایسے تھے جن کو وہ اس کی ذات میں بھی شریک تصور کرتے تھے۔ مثلاً ملائکہ کے متعلق ان کا تصور یہ تھا کہ یہ خدا کی بیٹیاں ہیں جو اس کی بڑی چہیتی ہیں، ان کی پرستش، شفاعت اور نجات کا ذریعہ ہوگی۔ قرآن نے یہاں ان کے اسی زعم کی تردید کی ہے کہ خدا کے سوا جو بھی ہیں سب اسی کی

مخلوق ہیں۔ کسی چیز کو بھی اس کے جزو ہونے کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ یہ انسان کا انتہائی ناشکرا پن ہے کہ اس کو سب کچھ حاصل تو ہوا ہے خدا سے لیکن وہ دوسروں کو دیوی دیوتا بنا کر ان کے گن گاتا اور ان کی پرستش کرتا ہے۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس آیت کی زد اس عقیدہ وحدت الوجود پر بھی پڑتی ہے جس کے اصل موجد تو ہندو فلسفی ہیں لیکن ہمارے صوفیوں کے ایک گروہ نے اسلام میں بھی اس کو لا گھسایا ہے۔ اس عقیدے کے بموجب تمام کائنات اور اس کی ہر چیز خدا کے جزو کی حیثیت حاصل کر لیتی ہے۔ تو جب مشرکین عرب کا فرشتوں کو خدا کا جزو بنانا شرک ٹھہرا تو ساری کائنات کو خدا کا جزو بنا دینا توحید کس طرح بن جائے گا۔

أَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنَاتٍ وَّأَصْفٰكُم بِالْبَنِيْنَ ۝ وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ (۱۶-۱۷)

مشرکین کے عقیدے کا بھونڈا پن اخلاقی پہلو سے

'اَمْ' استنکار و استعجاب کے مفہوم میں ہے۔ مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں جو قرار دیتے تھے، ان کے اس عقیدے پر ایک دوسرے پہلو سے نکیر فرمائی۔ اوپر والی آیت میں ان کے جزو خدا ہونے کی تردید تھی۔ اس آیت میں ایک نفسیاتی پہلو سے ان کے اس عقیدے کے بھونڈے پن کو واضح فرمایا کہ صرف یہی ستم نہیں ہے کہ خدا کی مخلوقات کو اس کا ایک جزو بنائے دے رہے ہیں بلکہ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ بیٹیوں کو اپنے لیے تو ایک نہایت نفرت کی چیز سمجھتے ہیں لیکن خدا کی طرف ان کو منسوب کرنے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتے۔ کوئی اُن سے پوچھے کہ جب خدا ہی سب کچھ پیدا کرتا ہے تو اس نے اپنے لیے بیٹیاں کیوں پسند کیں جب کہ ان کا اپنا حال یہ ہے کہ ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خبر دی جائے تو غم سے اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ برابر گھٹا گھٹا رہنے لگتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس عقیدہ کے گھڑنے میں صرف یہی نہیں کہ عقل سے انھوں نے کوئی کام نہیں لیا بلکہ یہ اس احساس شرافت کی بھی بالکل نفی ہے جو انسانی فطرت کا بالکل بدیہی تقاضا ہے۔ اگر ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ خدا کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا تو کم از کم وہ اتنا انصاف تو کرتے کہ خدا کی طرف وہ چیز نہ منسوب کرتے جس سے وہ خود اس درجہ بیزار و نفور ہیں۔ یہ عقیدہ ایجاد کر کے انھوں نے صرف عقل ہی کی تذلیل نہیں کی ہے بلکہ احساس عدل سے اپنی بے مائگی کا ثبوت بھی دیا ہے۔

ناقص العقل اور بے مایہ احساس کی ترجمانی

أَوَمَن يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ (۱۸)

یہ ان کے اس احساس کی تعبیر ہے جو لڑکی کی ولادت کی خبر سن کر ان کے دل میں پیدا ہوتا اور ان

کی گھٹن کا باعث ہوتا ہے۔ فرمایا کہ وہ اس سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ کیا وہ وجود میں آئی ہے جو زیوروں میں پلتی اور مفاخرت کے مقابلوں میں بالکل بے زبان ہے۔

لفظ 'خِصَامٌ' یہاں مبارزت اور مفاخرت دونوں معنوں پر مشتمل ہے اور عرب جاہلیت ان دونوں ہی چیزوں کے رسیا تھے۔ ان کے ہاں آئے دن جنگیں بھی برپا ہوتی رہتیں اور مفاخرت کے مقابلے بھی ہوتے رہتے جن میں ہر قبیلہ کے خطیب اور شاعر اپنے اپنے قبیلہ کے مفاخر بیان کرنے میں دادِ خطابت و شاعری دیتے۔ ظاہر ہے کہ عورت ان دونوں ہی میدانوں میں فروتر تھی، نہ وہ زرہ بکتر اور شمشیر و سناں کی مخلوق تھی اور نہ خطابت و شاعری کی! اس وجہ سے اہلِ عرب کی نگاہوں میں اس کی کچھ زیادہ اہمیت نہ تھی اور یہ بات کچھ اہلِ عرب ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اس زمانے میں بھی عورت کو جو اہمیت حاصل ہوئی ہے وہ نمائش کی مجالس ہی میں ہوئی ہے۔ مبارزت اور مفاخرت کے اعتبار سے تو آج بھی وہ وہیں ہے جہاں عرب جاہلیت کے دور میں تھی۔ یہ امر یہاں اچھی طرح ملحوظ رہے کہ عورت پر یہ تبصرہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے بلکہ ان اہلِ عرب کی طرف سے ہے جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ عام طور پر مفسرین نے یہ خیال کیا کہ یہ تبصرہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ یہ غلط فہمی لوگوں کو کلام کے سیاق پر نہ غور کرنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْئَلُوْنَ (۱۹)

اس واہمہ کی تردید ایک اور پہلو سے

ان کے اس واہمہ پر ایک اور پہلو سے بھی ضرب لگائی۔ فرمایا کہ انھوں نے فرشتوں کو جو عورتیں بنا کر رکھ دیا ہے تو آخر ان کے اس دعوے کی بنیاد کیا ہے؟ کیا جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو پیدا کیا تو یہ اس وقت موجود تھے! اس کے بعد نہایت سخت الفاظ میں دھمکی دی ہے کہ ان کا یہ دعویٰ لوٹ رہے گا اور ایک دن ان سے اس کی پرسش ہونی ہے۔ فرشتوں کے متعلق یہ پوری بحث سورۂ صافات کی تفسیر میں بھی گزر چکی ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر ڈال لیجیے۔

اپنی حماقت کی تائید میں مشرکین کی شرعی دلیل اور اس کی تردید

وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۞ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ۞ بَلْ قَالُوْا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ (۲۰-۲۲)

اپنی اس حماقت کی تائید و تصویب میں مشرکین جو شرعی دلیل پیش کرتے یہ اس کا حوالہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا ان کو پوجنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ خدا کو ان کی عبادت پسند ہے۔

اگر یہ چیز اس کو پسند نہ ہوتی تو اس کی قدرت میں تو سب کچھ ہے، وہ اپنی مشیّت کے زور سے اس کو روک دیتا اور ہم ان کی عبادت نہ کر پاتے۔ جواب میں فرمایا کہ یہ محض ان کی اٹکل پچّو باتیں ہیں۔ اس باب میں ان کو کوئی علم نہیں ہے۔ خدا کی پسند یا ناپسند کے جاننے کا یہ ذریعہ نہیں ہے کہ کسی شخص یا گروہ کو کسی برائی کے کرنے کی ڈھیل ملی ہوئی ہے۔ اگر یہ کوئی دلیل ہے تو یہ دلیل ہر چور، ہر زانی، ہر بدمعاش اپنی چوری اور بدمعاشی کے جواز بلکہ استحسان کی تائید میں پیش کر سکتا اور کہہ سکتا ہے کہ اگر یہ بات خدا کی مرضی کے خلاف ہوتی تو وہ اپنی مشیّت کے زور سے اس کو روک دیتا لیکن جب اس نے اس کو نہیں روکا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہم نے جو کچھ کیا اس کی مرضی سے کیا اور ہمارا یہ فعل اس کو پسند ہے۔

'اَمْ اٰتَیْنٰہُمْ کِتٰبًا مِّنْ قَبْلِہٖ فَہُمْ بِہٖ مُسْتَمْسِکُوْنَ'۔ فرمایا کہ خدا کی پسند اور ناپسند کے جاننے کا قابلِ وثوق ذریعہ اس کی کتابیں اور اس کے نبیوں کی تعلیمات ہیں تو کیا اس قرآن سے پہلے ہم نے ان کو کوئی کتاب دی ہے جس کو وہ سند میں پیش کر سکتے ہوں؟ اگر ایسا نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ نہیں ہے تو آخر وہ کس سند پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کو خدا کی تائید حاصل ہے؟

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّۃٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِہِمْ مُّہْتَدُوْنَ (۲۲)

مشرکین کی روایتی دلیل اور اس کی تردید

اوپر مشرکین کی کلامی دلیل کی تردید فرمائی ہے۔ اس پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ مشرکین عرب کو بھی بالکل اسی طرح کا دھوکا پیش آیا جس طرح کا دھوکا ہمارے ہاں مُجبرہ کو پیش آیا۔ اب یہ ان کی روایتی دلیل کا حوالہ ہے جس پر ان کو سب سے زیادہ اعتماد تھا اور چونکہ اس کی بنیاد تقلیدِ آباء پر ہے جس کا تعلق عقل کے بجائے مجرّد جذبات سے ہے اس وجہ سے ہر دَور کے اشرار نے اس ہتھیار سے فائدہ اٹھایا اور عوام کے جذبات بھڑکا کر مصلحین کی مساعیٔ اصلاح کو ناکام کرنے کی کوشش کی ہے۔

'اُمَّۃٌ' کے معنی، جیسا کہ اس کے محل میں وضاحت ہو چکی ہے، کسی قوم کے مجموعی طریقہ اور مسلک کے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ اپنی اس حماقت کی تائید میں یہ دلیل بھی لاتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک صحیح مسلک اور ایک اعلیٰ طریقہ پر پایا ہے اور ہم چونکہ انہی کے مسلک پر ہیں اس وجہ سے بالکل ہدایت کی راہ پر ہیں۔ انہی کے نقشِ قدم کی پیروی ہماری ہدایت کی ضامن ہوگی۔ اگر ہم اس سے ذرا منحرف ہوئے تو ہم ہدایت کی راہ سے بھٹک جائیں گے اس وجہ سے جو لوگ ہمیں اس راہ سے ہٹانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ ہماری تباہی کے درپے ہیں۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ لفظ 'اُمَّة' کی تنکیر اس کی عظمت کے اظہار کے لیے ہے۔

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ٥ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۲۳-۲۴)

ہر دور کے مکذبین کا طریقہ ایک ہی رہا ہے

فرمایا کہ یہ لوگ جس طرح اپنے دین کے معاملے میں اندھے مقلد ہیں اسی طرح اپنی دلیل میں بھی پچھلے انبیاء کے مکذبین کے مقلد ہیں۔ تم سے پہلے جو منذر بھی کسی بستی میں ہم نے بھیجا اس کے انذار اور اس کی دعوتِ اصلاح کا جواب قوم کے متکبرین نے یہی دیا کہ ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ایک خاص طریقہ پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقشِ قدم کی پیروی پر جمے رہیں گے۔ رسول نے جب ان سے یہ سوال کیا کہ اگر میں تمھارے باپ دادا کے طریقہ سے بہتر طریقہ تمھارے پاس لے کر آیا ہوں جب بھی تم اپنے باپ دادا کے طریقہ ہی پر جمے رہو گے! اس کے جواب میں انھوں نے جھلا کر کہا کہ ہم تو اس سارے ہی کے منکر ہیں جو دے کر تم بھیجے گئے ہو!

'اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ' سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ یہ جواب انھوں نے جھلا کر اور آپے سے باہر ہو کر دیا۔ اس لیے کہ جواب اصل سوال سے کئی قدم آگے ہے۔ رسول کا سوال تو صرف یہ تھا کہ اگر میرا طریقہ، جس کی میں دعوت دے رہا ہوں تمھارے باپ دادا کے طریقہ سے بہتر ہوا تو کیا اس صورت میں بھی تم اپنی اسی ہٹ پر قائم رہو گے۔ جواب میں انھوں نے کہا کہ ہم تمھاری ہر بات کے منکر ہیں۔ یعنی مسئلہ 'اَهْدٰى' اور 'غیر اھدٰی' کے امتیاز کا نہیں ہے بلکہ ہم تمھاری کوئی بات سرے سے سننے اور ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔

دوسری یہ کہ کسی شے کے 'اھدٰی' اور 'غیر اھدٰی' میں امتیاز کی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ودیعت فرمائی ہے بشرطیکہ انسان کے پاس گوشِ حقیقت نیوش ہو۔ وہ مغرور، ضدی اور ہٹ دھرم نہ ہو۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (۲۵)

مطلب یہ ہے کہ جب قوموں کی ضد اور مکابرت اس حد کو پہنچ گئی کہ انھوں نے رسولوں کی بات سننے اور سمجھنے سے انکار کر دیا تب اللہ تعالیٰ نے ان سے کفرانِ نعمت کا انتقام لیا، پھر دیکھو کہ رسولوں کے جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا!!

۲۔ آگے کا مضمون ——— آیات: ۲۶-۴۵

آگے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت اور شرک سے ان کے اعلانِ براءت کا حوالہ ہے جس سے مقصود

اس حقیقت کا اظہار ہے کہ قریش کا یہ دعویٰ بالکل باطل ہے کہ جس دینِ شرک کی وہ پیروی کر رہے ہیں یہ ان کو ان کے آباء و اجداد سے وراثت میں ملا ہے۔ ان کے اصل جدِ امجد تو حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جنھوں نے شرک ہی کی بنا پر اپنی قوم کو چھوڑا اور ان کی اس ہجرت اور اعلانِ برارت کی روایت آج تک ان کی ذریت کی دونوں شاخوں میں موجود ہے۔ پھر قریش کس طرح یہ کہتے ہیں کہ وہ اپنے آباء و اجداد کے طریقہ پر چل رہے ہیں۔

اس تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد قریش کی سرکشی کے اصل اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ تم اپنی دعوتِ حق پر جمے رہو۔ انبیاء کا اصل راستہ یہی ہے جس کی طرف تم لوگوں کو بلا رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو ابھی تمھارے اور تمھارے مخالفوں کے درمیان فیصلہ کر دے لیکن اس کی سنت یہ ہے کہ ایک خاص حد تک وہ حق کے دشمنوں کو بھی مہلت دیتا ہے ۔۔۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۶ - ۴۵

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۶﴾ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ﴿۲۷﴾ وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾ بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۹﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿۳۱﴾ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ

عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا
يَتَّكِـُٔوْنَ ﴿۳۴﴾ وَزُخْرُفًا ۭ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا ۭ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۵﴾ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ
ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴿۳۶﴾ وَ
اِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ
مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۷﴾ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَ
بَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ﴿۳۸﴾ وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ
الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۹﴾ اَفَاَنْتَ
تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِي الْعُمْيَ وَمَنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۰﴾
فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ﴿۴۱﴾ اَوْ نُرِيَنَّكَ
الَّذِيْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ ﴿۴۲﴾ فَاسْتَمْسِكْ
بِالَّذِيْٓ اُوْحِيَ اِلَيْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۳﴾ وَاِنَّهٗ
لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔــلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَسْـَٔــلْ مَنْ
اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ
اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴿۴۵﴾ ع

ترجمہ آیات ۲۶-۴۵

اور یاد کرو جب کہ ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ میں ان چیزوں سے بالکل بری ہوں جن کو تم پوجتے ہو۔ میں صرف اسی کو پوجتا ہوں جس نے مجھ کو پیدا کیا۔ پس بے شک وہی میری رہنمائی فرمائے گا۔ اور اس کو اس نے ایک پائدار روایت

کی حیثیت سے چھوڑا اپنے اخلاف میں تاکہ لوگ اسی کی طرف رجوع کریں۔ ۲۶-۲۸

بلکہ یوں ہوا ہے کہ میں نے ان کو اور ان کے آباء و اجداد کو دنیا سے بہرہ مند کیا یہاں تک کہ ان کے پاس حق اور ایک واضح کر دینے والا رسول آیا اور جب ان کے پاس حق آگیا، انھوں نے کہا یہ تو جادو ہے اور ہم اس کے منکر ہیں۔ ۲۹-۳۰

اور انھوں نے اعتراض اٹھایا کہ یہ قرآن دونوں بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا! کیا تیرے رب کے فضل کو یہی تقسیم کرتے ہیں! دنیا کی زندگی میں ان کی معیشت کا سامان تو ہم نے تقسیم کیا ہے اور ایک کے درجے دوسرے پر بلند کیے ہیں تاکہ وہ باہم دگر ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔ اور تیرے رب کی رحمت اس سے بہتر ہے جو یہ جمع کر رہے ہیں۔ ۳۱-۳۲

اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ لوگ ایک ہی ڈگر پر چل پڑیں گے تو جو لوگ خدائے رحمان کے منکر ہیں ہم ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کر دیتے اور زینے بھی چاندی کے جن پر وہ چڑھتے۔ اور ان کے گھروں کے کواڑ اور ان کے تخت بھی چاندی کے جن پر وہ ٹیک لگا کر بیٹھتے۔ اور یہ چیزیں سونے کی بھی کر دیتے۔ اور یہ چیزیں تو بس دنیا کی زندگی کی متاع ہیں اور آخرت تیرے رب کے پاس متقیوں کے لیے ہے۔ ۳۳-۳۵

اور جو خدا کے ذکر سے اعراض کرلیتا ہے تو ہم اس پر ایک شیطان مسلّط کر دیتے ہیں جو اس کا ساتھی بن جاتا ہے اور وہ ان کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ہدایت پر ہیں۔ یہاں تک کہ جب یہ ہمارے پاس آئے گا تو

کہے گا کہ کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق کے دونوں کناروں کی دوری ہوتی! پس کیا ہی بُرا ساتھی ہو گا! اور جب کہ تم نے اپنے اوپر ظلم ڈھائے تو یہ چیز آج تم کو ذرا بھی نافع نہیں ہو گی کہ تم عذاب میں ایک دوسرے کے شریک ہو۔ ۳۶-۳۹

پس کیا تم بہروں کو سناؤ گے یا اندھوں کو راہ دکھاؤ گے اور ان کو جو کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہیں! پس یا تو یہ ہو گا کہ ہم تم کو اٹھا لیں گے پھر ان سے بدلہ لیں گے یا تم کو دکھا دیں گے وہ چیز جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے سو ہم ان پر پوری طرح قادر ہیں۔ پس اس کو مضبوطی سے تھامے رکھو جو تمھارے اوپر وحی کی گئی ہے۔ بے شک تم ایک سیدھی راہ پر ہو۔ اور یہ تمھارے لیے اور تمھاری قوم کے لیے یاددہانی ہے اور عنقریب تم سب سے پرسش ہونی ہے۔ اور پوچھو ان سے جن کو ہم نے تم سے پہلے بھیجا اپنے رسولوں میں سے کیا ہم نے خدائے رحمان کے سوا دوسرے معبود ٹھہرائے جن کی عبادت کی جائے! ۴۰-۴۵

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖۤ اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ (۲۶)

حضرت ابراہیم کے اعلانِ برا‌ءت کی یاددہانی

'بَرَآءٌ' مصدر ہے جو صفت کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مصدر جب صفت کے مفہوم میں استعمال ہو تو اس کے اندر مبالغہ کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے جیسے 'زید عدل' اس وجہ سے اِنَّنِیْ بَرَآءٌ کے معنی ہوں گے 'میں تم سے یک قلم بری ہوں، میرے اور تمھارے درمیان اب کوئی رابطہ باقی نہیں رہا۔

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس اعلانِ براءت کا حوالہ ہے جس کا ذکر پچھلی سورتوں میں تفصیل سے ہو چکا ہے اور مقصود اس حوالہ سے، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، قریش پر اس حقیقت کا اظہار ہے کہ وہ اپنے شرک کی حمایت میں اپنے آبا و اجداد کا حوالہ جو دیتے ہیں تو آخر اپنے

اصل جدِ امجد کو کیوں بھول جاتے ہیں جنھوں نے شرک سے بیزاری ہی کی بنا پر اپنے باپ، اور اپنی قوم کو چھوڑا اور اپنی ذریّت کو اس وادیٔ غیر ذی زرع میں بسایا! مطلب یہ ہے کہ ان کو اگر اپنے اجداد کے دین پر ناز ہی ہے تو سب سے زیادہ مایۂ ناز تو حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جن کی برکت سے ان کو دین اور دنیا دونوں کی نعمتیں ملیں تو آخر ان کو چھوڑ کر انھوں نے ان جاہلوں کی تقلید کیوں اختیار کی جنھوں نے ان کو اصل بزرگ خاندان کے دین سے ہٹا کر شرک کے جوہڑ میں گرایا۔

یہ اعلانِ براءت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنے باپ کے سامنے کیا، جیسا کہ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ کے الفاظ سے واضح ہے۔ اس میں قریش کو یہ تنبیہ ہے کہ وہ سوچیں تو ان کے جدِ امجد نے ان کے لیے روایت تقلیدِ آبا میں شرک پرستی کی نہیں بلکہ مبتلائے شرک باپ دادا سے بیزاری کی چھوڑی ہے۔

اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ (۲۷)

میرے نزدیک یہ استثنا مِمَّا تَعْبُدُوْنَ سے ہے جس طرح مشرکینِ عرب اللہ تعالیٰ کی بندگی کرتے تھے لیکن اس کے شریک ٹھہرا کر، اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم بھی خدا کی منکر نہیں تھی بلکہ اس کے شریک ٹھہراتی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اس اعلان سے قوم پر یہ واضح فرمایا کہ اللہ کے سوا، دوسرے دیوی دیوتا جو تم نے بنا رکھے ہیں، وہ تو بالکل بے حقیقت ہیں۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی بندگی میں کرتا ہوں اور کروں گا اس لیے کہ وہ میرا خالق و فاطر ہے اس وجہ سے بندگی کا حق دار ہے۔

فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ کا تعلق ان کے اعلانِ براءت سے ہے یعنی میں اپنے باپ اور اپنی قوم کو چھوڑنے کا جو اعلان کر رہا ہوں تو یہ اعلان ہے تو نہایت کٹھن۔ میں اس کی مشکلات سے واقف ہوں لیکن اپنے جس رب کی خاطر میں یہ بازی کھیل رہا ہوں مجھے امید ہے کہ وہ تمام مشکلات میں میری رہنمائی فرمائے گا۔

وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۲۸)

ضمیر منصوب کا مرجع وہی اعلانِ براءت و ہجرت ہے جس کا ذکر اوپر گزرا۔ اس نوع کی ضمیریں پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔

كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً سے مراد پائدار اور باقی رہنے والی روایت (TRADITION) ہے۔ اس اعلانِ براءت یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے قول و عمل اور اپنی تعلیم و تذکیر سے اپنے اس اعلانِ براءت و ہجرت کو اپنی ذریّت میں ایک مستحکم روایت کی حیثیت دے دی۔ اسلاف، اخلاف کو یہ روایت کی روایت اخلاف ہمیشہ باقی رہی

منتقل کرتے اور اس کو زندہ رکھنے کی برابر وصیت اور تاکید کرتے رہے۔ ذرّیتِ ابراہیمؑ کی ایک شاخ یعنی بنی اسرائیل میں اس کا چرچا ان کے صحیفوں اور ان کے اندر مبعوث ہونے والے انبیاء کی تعلیم و تذکیر سے قائم رہا۔ دوسری شاخ یعنی بنی اسماعیل میں چونکہ انبیاء نہیں مبعوث ہوئے اس وجہ سے اس کا چرچا کچھ مدت بعد کمزور پڑ گیا تاہم اس کے اندر بھی ایک گروہ برابر ان لوگوں کا باقی رہا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دینِ حنیفی کے پیرو، ان کی دعوتِ توحید کے حامل اور ان کی شرک بیزاری کی روایات کے امین رہے۔

'لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ' یعنی یہ روایت انھوں نے اپنی ذرّیت میں اس لیے چھوڑی کہ ان کے لیے نشانِ راہ کا کام دیتی رہے۔ جب کبھی شیطان ان کو بھٹکانے لگے یا وہ بھٹک جائیں تو اس نشان کو دیکھ کر پھر صراطِ مستقیم کی طرف پلٹ سکیں۔

بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۲۹-۳۰)

مخالفت کی اصل علت: 'حق' سے مراد قرآن مجید ہے اور 'اٰبَآءَهُمْ' کے بعد 'فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ' کے الفاظ بربنائے وضاحتِ قرینہ محذوف ہیں۔ سورۂ حدید آیت ۱۶ میں بالکل اسی سیاق میں مذکورہ الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ نیز سورۂ انبیاء آیت ۴۴ میں بھی مضمون اس طرح آیا ہے: 'بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ' (بلکہ ہم نے ان کو اور ان کے آباء و اجداد کو دنیا کی نعمتوں سے بہرہ مند کیا یہاں تک کہ اسی حال میں ان پر ایک طویل مدت گزر گئی)۔

مطلب یہ ہے کہ یہ تو محض ان کی سخن سازی ہے کہ قرآن کی مخالفت وہ اس بنا پر کر رہے ہیں کہ اس کی دعوت ان کے دینِ آباء کے خلاف ہے بلکہ اس مخالفت کی اصل علت یہ ہے کہ اللہ نے ان کو اور ان کے آباء و اجداد کو دنیا کی نعمتوں سے بہرہ مند کیا اور اس رفاہیت پر ایک طویل مدت گزر چکی ہے جس کے سبب سے ان کے دلوں پر قساوت چھا گئی ہے۔ اب جو ان کے پاس قرآن اور حقائق کو روشن کر دینے والا رسول آیا تو یہ دعوت و تعلیم ان کے دلوں پر شاق گزر رہی ہے۔ وہ اس کے قبول کرنے میں اپنے دنیوی مفادات کے لیے خطرہ تصور کرتے ہیں اس وجہ سے اپنے عوام کو اس سے برگشتہ کرنے کے لیے اس کو سحر قرار دیتے ہیں۔

قرآن کو سحر کہنے کی اصل علت: قرآن کو قریش جو سحر کہتے تو اس کا ایک خاص پہلو تھا جس پر ہم دوسرے مقام میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ کوئی حقیقت اگر صحیح الفاظ میں سامنے آئے تو لازماً وہ دلوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ قرآن چونکہ سراسر حقیقت ہے، جیسا کہ لفظ 'حق' سے واضح ہے اور اس کا اسلوبِ بیان بھی معجزانہ ہے اس وجہ سے وہ قدرتی طور پر ان لوگوں کے دلوں پر اثر انداز ہوتا جو مفاد پرست نہیں تھے اور جن کو قریش کے

لیڈروں کی طرح یہ اندیشہ نہیں تھا کہ اس کے ظہور سے ان کی سیادت کو کوئی خطرہ لاحق ہے۔ اس طرح کے لوگوں کو قرآن کے اثر سے بچائے رکھنے کے لیے قریش کے لیڈر یہ تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ قرآن ایک لغو اور بے معنی کتاب ہے۔ اگر وہ یہ کہتے تو ان کے عوام خود ان کو بے وقوف ٹھہراتے کہ یہ سورج پر خاک ڈالنے کی کوشش ہے۔ البتہ وہ عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے تھے کہ قرآن میں جو بلاغت و جزالت ہے وہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ یہ آسمان سے نازل ہوا ہے، جیسا کہ اس کے پیش کرنے والوں کا دعویٰ ہے، بلکہ یہ محض الفاظ کی جادوگری ہے جس میں ہمارے شاعروں اور خطیبوں کی طرح اس کو پیش کرنے والا بھی ماہر ہے۔ گویا ان کی کوشش یہ تھی کہ لوگوں کے دلوں پر یہ اثر پڑنے نہ پائے کہ قرآن خدائی وحی ہے بلکہ لوگ اس کو اسی درجے میں رکھیں جس درجے میں اپنے بڑے شاعروں اور خطیبوں کے کلام کو رکھتے ہیں۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ (۳۱)

عوام فریبی کے لیے ایک اور اشغلہ

قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے عوام کو برگشتہ کرنے کے لیے یہ بات بھی قریش کے لیڈر کہتے کہ اگر یہ کتاب خدا کی نازل کی ہوئی ہے تو آخر یہ مکہ یا طائف کے کسی بڑے سردار پر کیوں نہیں نازل کی گئی! 'مِنَ الْقَرْیَتَیْنِ' سے مراد مکہ اور طائف ہیں اس لیے کہ یہی دو بستیاں عرب کے سادات و اشراف کا مرکز تھیں۔ پشتہا پشت سے عرب کی سیادت و قیادت انہی لوگوں کو حاصل رہی تھی اس وجہ سے سادہ لوح عوام کو یہ بات آسانی سے باور کرائی جا سکتی تھی کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ کو اگر لوگوں کی رہنمائی کے لیے کوئی چیز اتارنی ہی ہوتی تو وہ انہی دونوں بستیوں میں سے کسی رئیس ابن رئیس پر اتارتا، ان کو چھوڑ کر، وہ ایک ایسے شخص کا انتخاب کیوں کرتا جو ایک غریب ابن غریب ہے اور جس کی بات سننے کے لیے امراء مشکل ہی سے تیار ہو سکتے ہیں۔

اَهُمْ یَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُمْ مَّعِیْشَتَهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا

معترضین کو جواب

یہ ان فراعنہ کی رعونت کا جواب ہے کہ ان کی یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کا اجارہ دار وہ اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔ انہی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ جس نعمت سے جس کو چاہیں نوازیں اور جس کو چاہیں محروم رکھیں۔ حالانکہ اس دنیا میں بھی ان کو جو وسائلِ معیشت حاصل ہوئے ہیں، خدا ہی کی تقسیم سے حاصل ہوئے ہیں۔ انھوں نے خود نہیں حاصل کیے ہیں۔ اگر یہ خود حاصل کر لینے والے ہوتے تو ان اغنیاء کے درمیان درجات و مراتب کا تفاوت کیوں ہوتا! اپنے اختیار میں معاملہ ہوتے ہوئے کوئی خود اس بات پر کیوں راضی ہوتا کہ وہ کسی پہلو سے دوسرے سے فروتر ہو کر رہے۔ اپنی خواہش کے خلاف یہ فرقِ مراتب اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ تقسیم کا معاملہ ان کے ہاتھ میں نہیں بلکہ کسی اور ہی کے ہاتھ میں ہے جو اپنی صوابدید اور حکمت

کے مطابق جس کو چاہتا ہے زیادہ دیتا ہے جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے۔

'وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا'۔ 'اِتَّخَذَ فُلَانٌ فُلَانًا سُخْرِيًّا' کے معنی ہیں فلاں نے فلاں کو اپنے کام یا اپنی خدمت میں لگایا۔

تفاوتِ درجات کی حکمت

یہ حکمت بیان فرمائی اس بات کی کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ذہنی اور مادی دونوں ہی اعتبار سے درجات و مراتب کا تفاوت کیوں رکھا ہے؟ فرمایا کہ ایسا اس نے اس وجہ سے کیا ہے کہ لوگ باہم دگر تعاون کی زندگی بسر کریں اور ایک دوسرے کو اپنے کام میں لگا سکیں۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے آزمائش کے لیے بنائی ہے اس وجہ سے اس کا نظام اس نے اس طرح کا رکھا ہے کہ اس میں ہر شخص دوسروں کا محتاج بھی ہے اور محتاج الیہ بھی۔ بڑے سے بڑا بادشاہ بھی دوسروں کا محتاج ہے اور چھوٹے سے چھوٹا آدمی بھی اس میں محتاج الیہ ہے۔ یہاں کوئی شخص بھی دوسروں سے مستغنی نہیں اور کوئی شخص بھی ایسا نہیں کہ معاشرہ میں کسی نہ کسی پہلو سے اس کی افادیت نہ ہو۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ خالق کائنات نے ہر شخص کو ایک ہی درجے کی صلاحیت، ایک ہی طرح کے ذوق، ایک ہی مرتبہ کی ذہانت اور ایک ہی حیثیت کے وسائل و ذرائع کے ساتھ نہیں پیدا کیا بلکہ ان اعتبارات سے لوگوں کے درمیان بڑا تفاوت رکھا ہے۔ یہ تفاوت معاشرہ کی تشکیل اس طرح کرتا ہے کہ اس میں ایک طرف متبحر عالم، نامور مصنف، یکتائے روزگار محقق، شہرۂ آفاق مدبر اور طاقتور حکمران بھی پیدا ہوتے ہیں، دوسری طرف کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور، گٹھڑیاں ڈھونے والے قلی، حاضر خدمت رہنے والے خادم، گلیاں اور نالیاں صاف کرنے والے مہتر بھی اس میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سارے طبقات معاشرہ کی تشکیل کے لیے ضروری بلکہ ناگزیر ہیں۔ ان سب کی خدمت کی نوعیت الگ الگ ہے مگر ان میں سے کوئی عنصر بھی نہ حقیر ہے اور نہ ان میں سے کسی کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ معاشرہ کی مشین جاری رکھنے کے لیے اس مشین کے چھوٹے سے چھوٹے پرزے کی دیکھ بھال بھی، اس کی افادیت کی نسبت سے ضروری ہے۔

دنیا کو درجات و مراتب کے اس فرق کے ساتھ پیدا کر کے اللہ تعالیٰ امتحان کر رہا ہے کہ جو لوگ اعلیٰ صلاحیتوں اور بہتر وسائل کے امین بنائے گئے ہیں وہ اپنے وسائل اور اپنی صلاحیتیں کس طرح استعمال کر رہے ہیں؟ ان کو پا کر وہ غرور، خودسری، تغلب اور خالق کائنات کی نافرمانی میں مبتلا ہو گئے ہیں یا اس کے شکر گزار و فرمانبردار اور اس کی خلق کے غمگسار رہیں؟ اسی طرح وہ ان لوگوں کو بھی دیکھ رہا ہے جو فروتر اور کمتر وسائل کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں کہ وہ اپنے اپنے دائرۂ کار میں اپنے فرائض کو پہچاننے والے اور اپنے خالق سے ڈرنے والے، اپنی خودی اور خودداری

کی حفاظت کرنے والے ہیں یا اپنے فرائض چھوڑ کر اس خبط میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ انھیں ان لوگوں کو نیچا دکھانا چاہیے جو ان کے حاکم اور افسر بنے ہوئے ہیں۔

اگر ان میں سے پہلی صورت وجود میں آتی ہے تو اعلیٰ اور ادنیٰ کے صالح تعاون سے صالح معاشرہ اور صالح تمدن وجود میں آتا ہے اور اس کے تمام اجزاء بلا امتیاز اعلیٰ و ادنیٰ اس دنیا میں بھی عزت پاتے ہیں اور آخرت میں بھی ہر ایک اپنی اپنی خدمات، اور اپنے حسنِ نیت کے مطابق صلہ پائے گا۔ اگر دوسری شکل ہوتی ہے تو معاشرہ کا نظام بالتدریج مائل بہ فساد ہونا شروع ہوتا ہے اور بالآخر فنا ہو جاتا ہے اور آخرت میں بھی اس کے تمام بڑے اور چھوٹے عناصر اپنی اپنی شرارت یا غفلت کے مطابق خدا کے عذاب کے مستحق ٹھہریں گے۔

اس زمانہ میں جو لوگ اس خبط میں مبتلا ہیں کہ وہ دنیا سے طبقات کے وجود کو مٹا کے رہیں گے وہ اس ارادے میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک وہ لوگوں کو ذہنی، مزاجی، طبعی اور عملی صلاحیتوں کے اعتبار سے مساوی درجہ کا بنانے میں کامیاب نہ ہو جائیں اور یہ چیز محال ہے۔ جن قوموں نے اس خبط میں مبتلا ہو کر خون کے دریا بہا دیے ان کا حال بھی یہ ہے کہ وہاں بڑے سے بڑے فراعنہ بھی موجود ہیں اور ان فراعنہ کے بوٹوں پر پالش کرنے والے اور گلیوں میں جھاڑو دینے والے بھی موجود ہیں۔ اور اگر وہ اس محال کو ممکن بنانے میں کامیاب ہو گئے یعنی انھوں نے پوری قوم کو صلاحیتوں اور ذہنی و مادی قوتوں کے اعتبار سے ایک درجہ پر کر دیا تو اسی دن باہمی تعاون کی بنیاد ختم ہو جائے گی اور قوم میں انارکی پھیل جائے گی۔ جب ہر شخص لینن اور سٹالن بننے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لے گا تو آخر وہ لینن یا ماؤ کی کار چلانے والا ڈرائیور یا ان کے جوتوں پر پالش کرنے والا خدمت گار بننے پر کیوں قانع ہو گا! پھر تو ہر شخص خداوندی بننے کی کوشش کرے گا اور اتنے خداؤں کی کشمکش میں اس دنیا کا جو حشر ہو گا اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے!!

وَلَوْلَآ اَنْ یَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ یَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُیُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَیْهَا یَظْهَرُوْنَ ۝ وَلِبُیُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَیْهَا یَتَّكِـُٔوْنَ (۳۳-۳۴)

حذف کا ایک اسلوب

یہاں 'مِنْ فِضَّةٍ' کے الفاظ جس طرح 'سُقُفًا' کے بعد آئے ہیں اسی طرح 'مَعَارِجَ'، 'اَبْوَابًا' اور 'سُرُرًا' کے بعد بھی آنے چاہئیں لیکن فصیح عربی کے معروف اسلوب کے مطابق وہ حذف کر دیے گئے اس لیے کہ قرینہ خود ان کو واضح کر رہا ہے۔

متاعِ دنیا کی بے حقیقتی

اب یہ اس متاعِ دنیا کی بے حقیقتی واضح فرمائی جا رہی ہے جس کے غرور نے کفّار کو اس خبط میں مبتلا کیا کہ وہ سمجھنے لگے کہ جب اس دنیا کی ساری شوکت و عظمت ہم کو حاصل ہوئی تو یہ کیسے

طرح ممکن ہے کہ خدا کو کوئی کتاب اتارنی ہوتی تو اس کے لیے وہ ہمارے سوا کسی اور کو تلاش کرتا!

فرمایا کہ دنیا کے جس سروسامان پران کو یہ ناز ہے اس کی حقیقت، خدا کی نگاہوں میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ لوگ ایک ہی ڈگر پر چل پڑیں گے تو اللہ تعالیٰ کفر کرنے والوں کے گھروں کی چھتیں اور ان پر چڑھنے کے زینے اور ان کے کواڑ اور ان کے ٹیک لگانے کے تخت سب چاندی کے کر دیتا لیکن اس نے ایسا اس لیے نہیں کیا کہ یہ آزمائش لوگوں کے لیے بہت سخت ہو جاتی۔ عام لوگ جب دیکھتے کہ خدا کے کفر کرنے والوں کو یہ کچھ حاصل ہے تو لوگ اندھے ہو کر کفر ہی کی راہ اختیار کر لیتے۔ کوئی بڑا ہی نصیبہ ور ہوتا تو وہ اپنے ایمان کو اس فتنہ سے بچا پاتا۔ خلق کو اس آزمائش سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں سے اہل ایمان اور اہل کفر دونوں ہی کو حصہ دیا ہے البتہ آخرت میں اہل کفر کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

یہ بات جو فرمائی کہ لوگ ایک ہی ڈگر پر چل پڑتے، ایک کلیہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ عمومیت واکثریت کے اعتبار سے فرمائی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر دنیا صرف کافروں ہی کو ملتی تو اس دنیا میں بہت تھوڑے لوگ نکلتے جو ایمان کی راہ اختیار کرتے تاہم نکلتے ضرور، خواہ ان کی تعداد کتنی ہی کم ہوتی۔ انسان کی فطرت اللہ تعالیٰ نے ایسی بنائی ہے کہ شدید سے شدید امتحان میں بھی ان کے اندر سے ایسے جوہر قابل نکل آتے ہیں جو آگ کے سمندر سے گزر جاتے ہیں لیکن اپنے رب کو نہیں چھوڑتے۔

وَزُخْرُفًا ۭ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ (۳۵)

'زخرف' کا اعراب

'زُخْرُفٌ' کے معنی زینت کے بھی آتے ہیں اور سونے کے بھی جو زینت کا ذریعہ ہوتا ہے۔ تالیف کلام کے اعتبار سے اس کو 'مِنْ فِضَّةٍ' کے محل پر عطف بھی کر سکتے ہیں اور فعل بھی محذوف مان سکتے ہیں یعنی لَجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ زُخْرُفًا۔ مدعا میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوگا۔ یعنی اگر ہم چاہیں تو مذکورہ ساری چیزیں ان کے لیے سونے کی بھی بنا دیں یا ان کے لیے سونے کے ڈھیر اکٹھے کر دیں۔

'لَمَّا' کی تحقیق

'لَمَّا' یہاں 'اِلَّا' کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ اس 'ل' کی جگہ پر ہے جو 'اِن' مخففہ اور 'اِن' نافیہ کے درمیان بطور علامت فرق کے آیا کرتا ہے۔ بعض جگہ اس 'ل' کو اشباع یعنی کلام کے صوتی خلا کو بھرنے کے لیے 'لَمَّا' کر دیتے ہیں۔ مثلاً سورۂ طارق میں ہے: اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ (۴) (بے شک ہر جان پر ایک نگران ہے)۔ اصلاً تو یہ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَعَلَيْهَا

حَافِظٌ ہے۔ لیکن فقرے میں ایک قسم کا صوتی خلا رہ جاتا تھا اس وجہ سے آہنگ کو ٹھیک کرنے کے لیے اہل زبان کے معروف استعمال کے مطابق، اس کو لمبا کر دیا۔ حروف میں اس قسم کے اضافہ کی مثالیں عربی میں بہت ہیں لیکن یہاں ہمارے لیے زیادہ تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں، جن پر یہ لوگ ریجھے ہوئے ہیں، بس اس حیات چند روزہ کا متاع ہیں۔ اصل غیر فانی نعمتیں تو آخرت میں ملنے والی ہیں اور آخرت تمام تر تیرے رب کے پاس صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جو رب سے ڈرنے والے ہیں۔

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ (۳۶)

اصل حقیقت

یعنی ان کے یہ سارے شبہات و اعتراضات تو محض بناوٹی ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے خدا کی یاد سے بالکل اعراض کر لیا ہے اور سنت الٰہی یہ ہے کہ جو لوگ خدا کی یاد سے منہ موڑ لیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے اوپر ایک شیطان مسلط کر دیتا ہے جو ان کا دن رات کا ساتھی بن جاتا ہے پھر وہ اس وقت تک ان کی جان نہیں چھوڑتا جب تک ان کو جہنم کا فرزند نہ بنا لے۔

'عشا عن الشیئ' کے معنی کسی چیز سے اعراض کرنے کے آتے ہیں۔ انسان کے دل کی خصوصیت یہ ہے کہ جب تک خدا کی یاد سے آباد رہتا ہے اس وقت تک تو شیطان کو اس میں راہ نہیں ملتی لیکن جب انسان خدا سے غافل ہو جاتا ہے تو آہستہ آہستہ شیطان اس کے دل پر قبضہ جما لیتا ہے اور جب وہ قبضہ جما لیتا ہے تو پھر اس کے چنگل سے نکلنا آسان نہیں رہ جاتا۔ بہتر سے بہتر تذکیر و موعظت بھی جو اس کے سامنے آتی ہے شیطان اس کے خلاف شبہات و اعتراضات ایجاد کر کے اس کو اس سے برگشتہ کر دیتا ہے۔ البتہ جو لوگ اپنے دل اپنے رب کی یاد سے آباد رکھتے ہیں شیطان کو ان کے اندر گھسنے کی راہ نہیں ملتی اور اگر کبھی کسی غفلت کے سبب سے اس کو دراندازی کا کوئی موقع مل بھی جائے تو اس کو وہاں ٹکنے کی جگہ نہیں ملتی بلکہ بندہ کے متنبہ ہوتے ہی شیطان کو وہاں سے بھاگنا پڑتا ہے۔

وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (۳۷)

زبان کا ایک استعمال

اوپر والی آیت میں حرف 'مَنْ' چونکہ مبہم ہے، واحد اور جمع دونوں ہی کے لیے آ سکتا ہے، نیز لفظ 'شیطان' بھی عام ہے، اس سے شیاطین جن بھی مراد ہو سکتے ہیں اور شیاطین انس بھی، اس وجہ سے آیت زیر بحث میں ضمیریں جمع آئیں۔ یہاں حال ایک پورے گروہ کا بیان ہو رہا ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ اس طرح شیطان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں ان کا حشر یہ ہوتا ہے کہ شیاطین تو ان کو سیدھی راہ سے روک دیتے ہیں لیکن ان کے پھندوں میں پھنسے ہوئے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ وہ بالکل سیدھی راہ پر چل رہے ہیں۔

یہاں ضمیروں کا انتشار بھی قابل توجہ ہے۔ 'اِنَّھُمْ' کی ضمیر کا مرجع تو شیاطین ہیں اور 'یَحْسَبُوْنَ' کے فاعل وہ لوگ ہیں جو شیاطین کے پھندوں میں گرفتار ہیں۔ لیکن جہاں کلام کا مفہوم واضح ہو وہاں ضمیروں میں اس قسم کا انتشار کوئی عیب نہیں ہے۔ اس کی ایک نہایت واضح مثال سورۂ یوسف کی مندرجہ ذیل آیت میں گزر چکی ہے۔

حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ	یہاں تک کہ جب رسول اپنی قوم کے ایمان سے مایوس ہو
وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا	جاتے ہیں اور ان کی قوم کے لوگ یہ گمان کرنے لگتے ہیں
جَآءَهُمْ نَصْرُنَا	کہ ان کو جھوٹ موٹ عذاب کا ڈراوا سنایا گیا تھا تو رسولوں
(یوسف: ۱۱۰)	کے پاس ہماری مدد آجاتی ہے۔

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ (۳۸)

یعنی اس دنیا میں تو اس قسم کے ساتھیوں میں خوب گاڑھی چھنتی ہے لیکن جب آخرت میں ہمارے آگے پیشی ہوگی اور اس دوستی کا انجام سامنے آئے گا تو جس نے کسی شیطان کے پھندے میں پھنس کر اپنی عاقبت برباد کی ہوگی وہ اپنے ساتھی پر لعنت بھیجے گا اور کہے گا کاش میرے اور تیرے درمیان مشرقین کی دوری ہوتی!!

'فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ' یہ اس برے ساتھی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اظہار نفرت و لعنت ہے کہ کیا ہی برا ساتھی ثابت ہوا وہ جس نے بالآخر اپنے ساتھی کو اس کھڈ میں لا گرایا۔

زبان کا ایک اسلوب

'مشرقین' کا مفہوم عام طور پر مفسرین نے مشرق اور مغرب لیا ہے لیکن میرے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ عربی میں بعض مرتبہ تثنیہ کسی شے کے دونوں کناروں کی وسعت کے اظہار کے لیے آتا ہے۔ اسی طرح جمع بھی کسی شے کے اطراف و اکناف کی وسعت کے اظہار کے لیے آتی ہے۔ قرآن میں 'مغربین و مشرقین' اور 'مشارق'، 'مغارب' وغیرہ الفاظ اسی پہلو سے استعمال ہوتے ہیں۔ اس کی وضاحت دوسرے محل میں ہو چکی ہے۔

وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِى الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ (۳۹)

'اِذْ ظَّلَمْتُمْ' یعنی اذ ظلمتم انفسکم فی الحیٰوۃ الدنیا۔

جب گمراہ کرنے والے اور گمراہ ہونے والے ساتھیوں میں یہ جوتی بیزار ہوگی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو بتایا جائے گا کہ جب دنیا میں تم ایک دوسرے کے تابع اور متبوع بن کر اپنی جانوں پر ظلم ڈھا چکے اور تمہیں اس کے انجام پر غور کرنے کی توفیق نہ ہوئی تو اب ایک دوسرے پر لعنت کے ڈونگرے برسا کر کیا تسلی حاصل کرو گے؟ یہ چیز تم میں سے کسی کو بری کرنے والی نہیں بنے گی۔ اب تو بہرحال دونوں ہی کو یہ عذاب بھگتنا ہے تو اس کو بھگتو۔ اس لعن طعن کا موقع دنیا میں تھا لیکن وہاں تم ایک دوسرے

کے جاں نثار اور وفادار بنے رہے۔ جو وقت گزر چکا اب وہ ہاتھ آنے والا نہیں ہے۔

أَفَأَنتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ أَوْ تَهْدِي الْعُمْيَ وَمَن كَانَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (۴۰)

آنحضرت صلعم کو تسلی

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تمھاری تذکیر و موعظت کارگر ہو سکتی ہے تو ان لوگوں پر ہو سکتی ہے جن کے اندر دیکھنے سننے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت زندہ ہے۔ ان لوگوں کو آخر تم کس طرح سنا سکتے ہو جن کے کان بہرے ہوں اور جنھوں نے اپنی آنکھیں پھوڑ لی ہوں!

وَمَن كَانَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ۔ یعنی کسی کی گمراہی اگر کسی حقیقت کے خفا یا اس کی کم علمی و بے خبری کے سبب سے ہو تو اس کے ازالہ کی تدبیر کی جا سکتی ہے لیکن جو شخص بالکل کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہو، جس کا گمراہی ہونا خود اس پر بھی واضح ہو، اس کو ہدایت دینا کس کے امکان میں ہے۔

فَإِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَإِنَّا مِنْهُم مُّنتَقِمُونَ ۝ أَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِي وَعَدْنَاهُمْ فَإِنَّا عَلَيْهِم مُّقْتَدِرُونَ (۴۱-۴۲)

یہ بھی اسی تسلی کے سلسلہ کی بات ہے۔ فرمایا کہ ان ظالموں کو ان کے حال پر چھوڑو۔ اب یا تو یہ ہوگا کہ ہم تم کو اٹھا لیں گے اس کے بعد ان سے انتقام لیں گے یا جس عذاب کی ہم ان کو دھمکی دے رہے ہیں وہ تمھارے ہوتے ہوئے آجائے گا اور تم بھی ان کا انجام دیکھ لوگے۔ ہم ان کو عذاب دینے پر پوری طرح قادر ہیں۔ یہ مضمون یونس آیت ۴۶ اور الرعد آیت ۴۰ میں بھی گزر چکا ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو ان آیات پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِي أُوحِيَ إِلَيْكَ ۖ إِنَّكَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (۴۳)

یعنی ان لوگوں کی اس ژاژ خائی اور مخالفت کے علی الرغم تم اس دعوتِ توحید اور اس کتابِ عزیز پر جمے رہو جو تمھاری طرف وحی کی گئی ہے، سیدھی راہ پر تمھی ہو۔ 'صراطِ مستقیم' سے اشارہ یہاں خاص طور پر توحید کی اس دعوت کی طرف ہے جو اس سورہ میں اوپر دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارے مخالفین کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے وہ ایک بے بنیاد دعوے کے علمبردار ہیں اور تم ایک مضبوط بنیاد پر ہو۔ تم اپنے موقف پر جمے رہو۔ مخالفوں کے قدم بہت جلد اکھڑ جائیں گے۔

وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۖ وَسَوْفَ تُسْأَلُونَ (۴۴)

رسول اور قوم دونوں کی ذمہ داری

یعنی یہ قرآن جو تمھاری طرف وحی کیا گیا ہے تمھارے لیے بھی یاددہانی ہے اور تمھاری قوم کے لیے بھی یاددہانی ہے اور ایک دن تم سب سے پرسش ہونی ہے۔ تم سے یہ پرسش ہوگی کہ تم پر جو وحی کی گئی وہ تم نے لوگوں کو ٹھیک ٹھیک، بے کم و کاست پہنچا دی یا نہیں اور قوم کی طرف سے تم کو کیا جواب ملا؟ قوم سے یہ پرسش ہونی ہے کہ کیا تمھارے پاس کوئی نذیر نہیں آیا کہ تم نے اپنی یہ امت بلائی۔ سورۂ اعراف میں اس بات کا یوں ذکر ہوا ہے۔

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۝ (الاعراف: ۶-۷)	پس لازماً ہم ان لوگوں سے پوچھیں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور خود رسولوں سے بھی پوچھیں گے، پھر ہم ان کو پوری سرگزشت، پورے علم کی روشنی میں سنائیں گے، ہم کہیں غائب نہیں رہے ہیں۔

رسولوں اور ان کی قوموں سے سوال جواب کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہوا ہے۔

رسولوں پر بلاغ کی جو ذمہ داری ڈالی گئی ہے، ان سے اس کے متعلق پرسش ہونی ہے اور ان کی قوموں سے یہ پرسش ہوگی کہ اللہ کی اتنی بڑی نعمت جو رسول کی بعثت کی شکل میں، ان کو ملی اس کی انھوں نے کیا قدر کی۔ پھر جس انعام واکرام کے حقدار رسول اور ان کے ساتھی ٹھہریں گے وہ ان کو ملے گا اور جس نقمت و عذاب کے سزاوار ان کے مکذبین قرار پائیں گے وہ ان کے حصہ میں آئے گا۔ اس میں رسولؐ اور صحابۂ رسولؐ کے لیے تسلی اور مخالفین کے لیے تہدید ہے کہ معاملہ یہیں ختم ہو جانے والا نہیں ہے بلکہ ایک دن یہ سارا مقدمہ خدا کی عدالت میں بھی پیش ہوگا اور وہاں معلوم ہوگا کہ کون جیتا اور کون ہارا۔

وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ (۴۵)

یہ مشرکین کے اس دعوے کی تردید ہے کہ جن کو وہ پوجتے ہیں ان کی عبادت کا حکم خدا نے دیا ہے۔ فرمایا کہ خدا کے امر و نہی کے معلوم کرنے کا ذریعہ اس کے رسول ہیں تو جو رسول تم سے پہلے آئے ہیں ان سے معلوم کرو کہ خدا نے اپنے سوا کچھ دوسرے معبود بھی عبادت کے حق دار ٹھہرائے ہیں؟

وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا، ایک بلیغ اسلوب کلام ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں رُسُل سے مراد ان کے صحیفے اور ان کی تعلیمات ہیں جو ان کی دعوت کے ترجمان ہیں۔ کلام کا یہ اسلوب پچھلے صحیفوں میں اکثر استعمال ہوا ہے اور اعلیٰ خطیبوں کے خطبات میں بھی اس کی نہایت بلیغ مثالیں ملتی ہیں۔

۴۔ آگے کا مضمون — آیات: ۴۶-۵۶

آگے بالاجمال حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت بیان ہوئی ہے جس سے مقصود ایک تو اس انتقامِ الٰہی کی تاریخی شہادت پیش کرنا ہے جس کا ذکر اوپر آیات ۴۱-۴۲ میں ہوا ہے کہ رسول کی تکذیب کے بعد اس کی قوم کا فیصلہ لازماً ہو جاتا ہے، خواہ رسول کی زندگی ہی میں ہو یا اس کی ہجرت یا موت کے بعد۔ اللہ کا یہ انتقام اس کی ایک مقررہ سنت ہے جس کی گرفت سے کوئی قوم بھی نہیں بچی۔ فرعون جیسا جبّار بھی جب اس کی زد میں آیا ہے تو وہ بھی اپنی تمام افواج سمیت غرق

کر دیا گیا۔ اس کی قوت و صولت اس کے کچھ کام نہ آئی۔

دوسرے یہ اس حقیقت کی مثال ہے جو آیت ۴۰ میں بیان ہوئی ہے کہ جو لوگ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں برباد اور جان بوجھ کر گمراہی کی راہ اختیار کر لیتے ہیں ان کو کسی نشانی سے بھی ہدایت نہیں حاصل ہوتی۔ وہ بڑے سے بڑے معجزات دیکھنے کے بعد بھی اندھے ہی بنے رہتے ہیں۔ ان کی آنکھیں صرف خدا کے فیصلۂ عذاب ہی سے کھلتی ہیں۔

تیسرے اس میں اس حقیقت کی بھی شہادت ہے جو آیت ۴۵ میں مذکور ہوئی ہے کہ اللہ نے جتنے رسول بھی بھیجے سب وہی دعوتِ توحید لے کر آئے جس کی دعوت قرآن دے رہا ہے۔ کسی رسول نے بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور معبود کی عبادت کی دعوت نہیں دی ـــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۴۶-۵۶

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَقَالَ
إِنِّي رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٤٦﴾ فَلَمَّا جَاءَهُم بِآيَاتِنَا إِذَا هُم
مِّنْهَا يَضْحَكُونَ ﴿٤٧﴾ وَمَا نُرِيهِم مِّنْ آيَةٍ إِلَّا هِيَ أَكْبَرُ
مِنْ أُخْتِهَا ۖ وَأَخَذْنَاهُم بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٤٨﴾
وَقَالُوا يَا أَيُّهَ السَّاحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِندَكَ
إِنَّنَا لَمُهْتَدُونَ ﴿٤٩﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِذَا هُمْ
يَنكُثُونَ ﴿٥٠﴾ وَنَادَىٰ فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ قَالَ يَا قَوْمِ أَلَيْسَ لِي
مُلْكُ مِصْرَ وَهَٰذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِن تَحْتِي ۖ أَفَلَا
تُبْصِرُونَ ﴿٥١﴾ أَمْ أَنَا خَيْرٌ مِّنْ هَٰذَا الَّذِي هُوَ مَهِينٌ وَلَا
يَكَادُ يُبِينُ ﴿٥٢﴾ فَلَوْلَا أُلْقِيَ عَلَيْهِ أَسْوِرَةٌ مِّن ذَهَبٍ أَوْ جَاءَ
مَعَهُ الْمَلَائِكَةُ مُقْتَرِنِينَ ﴿٥٣﴾ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهُ
فَأَطَاعُوهُ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ ﴿٥٤﴾ فَلَمَّا آسَفُونَا

انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۵﴾ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ ع

ترجمۂ آیات ۴۶-۵۶

اور بے شک ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیان کے پاس بھیجا تو اس نے ان کو دعوت دی کہ میں تمھارے پاس عالم کے خداوند کا رسول ہو کر آیا ہوں۔ تو جب وہ ان کے پاس ہماری نشانیوں کے ساتھ آیا تو وہ ان نشانیوں کا مذاق اڑاتے۔ اور ہم ان کو ایک سے ایک بڑھ کر نشانیاں دکھاتے رہے اور ہم نے ان کو عذاب میں بھی پکڑا تاکہ وہ رجوع کریں۔ ۴۶-۴۸

اور انھوں نے درخواست کی کہ اے ساحر، اپنے رب سے اس عہد کی بنا پر جو اس نے تم سے کر رکھا ہے، ہمارے لیے دعا کرو۔ اب ہم ضرور ہدایت پانے والے بن کے رہیں گے۔ تو جب ہم ان سے عذاب ٹال دیتے تو وہ اپنا عہد توڑ دیتے۔ ۴۹-۵۰

اور فرعون نے اپنی قوم میں منادی کرائی۔ اے میری قوم کے لوگو! کیا مجھے مصر کی بادشاہی حاصل نہیں ہے! اور یہ نہریں ہیں جو میرے نیچے بہہ رہی ہیں! تو کیا تم لوگ دیکھتے نہیں! تو کیا یہ بہتر ہوا یا میں بہتر ہوں اس سے جو ایک حقیر آدمی ہے اور اپنی بات کھول کر کہہ بھی نہیں سکتا ہے! تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس کے لیے اوپر سے سونے کے کنگن اتارے گئے ہوتے یا اس کے ساتھ فرشتے پرے باندھے ہوئے آتے! پس اس طرح اس نے اپنی قوم کو بیوقوف بنا لیا اور انھوں نے اس کی بات مان لی۔ یہ لوگ نافرمان قسم کے لوگ تھے۔ تو جب ان لوگوں نے ہم کو غصہ دلا دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان سب کو غرق کر دیا اور ان کو ماضی کی ایک داستان

اور دوسروں کے لیے ایک نمونۂ عبرت بنا دیا۔ ۵۱-۵۶

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ اِنِّیْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۴۶)

'آیات' سے مراد وہ نشانیاں ہیں جن سے مسلح کر کے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس بھیجا، یعنی عصا اور ید بیضا وغیرہ۔

'ملاء' سے مراد قوم فرعون کے وہ اعیان و اکابر ہیں جو اس کے دربار میں باریاب ہوتے۔ ان الفاظ کی وضاحت پچھلی سورتوں میں ہو چکی ہے۔

'فَقَالَ اِنِّیْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت ہے جو انھوں نے فرعون اور اس کے اعیان کو دی۔ یہاں اس کی وضاحت نہیں ہے، صرف اجمالی اشارہ ہے لیکن دوسرے مقامات میں تفصیل ہے کہ انھوں نے فرعون اور اس کے درباریوں کو آگاہ کیا کہ وہ ان کے انذار کے لیے خدا کی طرف سے رسول ہو کر آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف سے نشانیاں بھی دی ہیں اور اللہ کے حکم سے ان کا مطالبہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو ان کے ساتھ عبادت کے لیے تین دن کی راہ بیابان میں جانے دیا جائے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ (۴۷)

یہاں اتنی بات بر بنائے قرینہ محذوف ہے کہ جب فرعون اور اس کے اعیان نے سنا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خداوند عالم کے رسول ہونے کے مدعی ہیں اور وہ اس دعوے کی تصدیق کی کچھ نشانیاں بھی اپنے پاس رکھتے ہیں تو انھوں نے مطالبہ کیا کہ جو نشانیاں وہ لے کر آئے ہیں، دکھائیں چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو نشانیاں دکھائیں لیکن ان کو ماننے کے بجائے انھوں نے ان کا مذاق اڑایا کہ بھلا یہ کیا نشانیاں ہیں، یہ تو ساحری کے کرتب ہیں اور ہمارے پاس بھی ایسے جادوگر ہیں جو ان سے بڑے کرتب دکھا سکتے ہیں۔

وَمَا نُرِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ اِلَّا هِیَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا ۡ وَاَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۴۸)

'نُرِيْهِمْ' سے پہلے فعل ناقص، زبان کے معروف قاعدے کے مطابق، محذوف ہے۔ — تنبیہی

یعنی ہم ان کو ایک سے ایک بڑھ کر نشانیاں دکھاتے رہے کہ وہ اللہ کی طرف رجوع کرنے والے — نشانیاں

تھیں۔ یہ ان نشانیوں کی طرف اشارہ ہے جو پہلی نشانیوں کی تکذیب کے بعد تنبیہی عذاب کے طور پر نازل ہوئیں تاکہ فرعونیوں کو خدا کی پکڑ کا کچھ اندازہ ہو اور وہ توبہ کی طرف مائل ہوں۔ یہ نشانیاں مختلف عذابوں کی شکل میں یکے بعد دیگرے ظاہر ہوئیں اور قدرتی طور پر ہر نشانی اپنی ماسبق سے زیادہ عبرت انگیز شکل میں نمایاں ہوئی۔ لیکن ان کے دلوں پر ایسی قساوت چھا چکی تھی کہ کوئی نشانی بھی کارگر نہ ہو سکی یہاں تک کہ وہ فیصلہ کن عذاب کی زد میں آ گئے۔

وَقَالُوْا یٰٓاَیُّہَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّکَ بِمَا عَہِدَ عِنْدَکَ ۚ اِنَّنَا لَمُہْتَدُوْنَ ۝ فَلَمَّا کَشَفْنَا عَنْہُمُ الْعَذَابَ اِذَا ہُمْ یَنْکُثُوْنَ (۴۹-۵۰)

جب وہ کسی عذاب کی گرفت میں آتے تو بھاگے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آتے اور نہایت لجاجت سے درخواست کرتے کہ آپ ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کیجیے کہ وہ اس عذاب کو دور فرمائے، اگر یہ عذاب دور ہو گیا تو ہم صحیح راہ پر آ جائیں گے اور آپ کی بات ضرور ہی مان لیں گے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ ان سے عذاب دور کر دیتا تو وہ عہد توڑ کر اپنی ضد پر اڑ جاتے۔

ان تنبیہی عذابوں کی تفصیل سورۂ اعراف کی آیات ۱۳۲-۱۳۵ کے تحت گزر چکی ہے۔ وہاں ہم تورات کی روشنی میں ہر بات کی وضاحت کر چکے ہیں۔ آیات ہم یہاں بھی نقل کیے دیتے ہیں۔ تفصیل مطلوب ہو تو تدبر قرآن میں ان کی تفسیر ملاحظہ فرمائیے۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَیْہِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ	تو ہم نے ان پر بھیجے طوفان اور ٹڈیاں اور جوئیں
وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰیٰتٍ	اور مینڈک اور خون، تفصیل کی ہوئی نشانیاں، تو
مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَکْبَرُوْا وَکَانُوْا	انھوں نے تکبر کیا اور یہ مجرم لوگ تھے اور جب آتی ان
قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ ۝ وَلَمَّا وَقَعَ	پر کوئی آفت تو درخواست کرتے کہ اے موسیٰ تم اپنے
عَلَیْہِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا یٰمُوْسَی ادْعُ	رب سے، اس عہد کے واسطہ سے جو اس نے تم سے
لَنَا رَبَّکَ بِمَا عَہِدَ عِنْدَکَ ۚ	کر رکھا ہے، ہمارے لیے دعا کرو۔ اگر تم نے ہم سے یہ
لَئِنْ کَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ	آفت دور کر دی تو ہم تمھاری بات ضرور مان لیں گے اور
لَکَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَکَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۝	تمھارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دیں گے تو جب ہم ان سے
فَلَمَّا کَشَفْنَا عَنْہُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓی اَجَلٍ ہُمْ	دور کر دیتے آفت کو کچھ مدت کے لیے جس تک وہ بہرحال
بٰلِغُوْہُ اِذَا ہُمْ یَنْکُثُوْنَ (الاعراف ۱۳۲-۱۳۵)	پہنچنے والے ہی ہوتے تو وہ دفعۃً عہد توڑ دیتے۔

مصریوں کے نزدیک ساحروں کا درجہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یٰٓاَیُّہَ السّٰحِرُ سے مخاطب کرنا کسی تحقیر یا سوءِ ادب پر مبنی نہیں ہے۔ مصر میں اس وقت ساحروں کو سوسائٹی میں وہی مقام حاصل تھا جو کسی سوسائٹی میں علما اور صوفیوں کو حاصل ہوتا ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ اے ساحر! ہمارے لیے دعا کیجیے، تعظیم کا خطاب ہے۔

'بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ' کی وضاحت سورۂ اعراف میں ہو چکی ہے۔ یعنی چونکہ آپ کے رب نے آپ کی دعا کی قبولیت کا آپ سے وعدہ کر رکھا ہے، اس وعدہ کے واسطہ سے آپ دعا کریں گے تو وہ ضرور ہی قبول ہوگی۔

'کَمَا' یہاں 'کُلَّمَا' کے مفہوم میں ہے۔ اس کی وضاحت سورۂ اعراف میں ہو چکی ہے۔ اس وجہ سے اس کے بعد 'اذا' کا استعمال جو مفاجات کے لیے آتا ہے، بالکل موزوں ہے۔

وَنَادٰی فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِهٖ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْکُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۵۱)

فرعون نے اپنی قوم میں پکارا، یعنی اپنی قوم میں منادی کرائی۔

حضرت موسیٰ کے مقابل میں فرعون کا اپنی برتری

اوپر آیات ۲۱-۲۵ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ وہاں قریش کے لیڈروں کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ (اگر یہ قرآن خدا کی طرف سے اترا ہے تو مکہ یا طائف کے سرداروں میں سے کسی پر کیوں نہیں اتارا گیا) ٹھیک اسی طرح فرعون نے جب دیکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دلائل و معجزات سے قوم کی عقیدت اس کے ساتھ متزلزل ہو رہی ہے تو اس نے یہ منادی کرائی کہ ملک مصر کی بادشاہی اور اس کی بہتی ہوئی نہریں تو میرے قبضہ میں ہیں تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ خدا کسی کو رسول بنانے والا ہوتا تو میرے سوا کسی اور کو رسول بناتا۔

اَمْ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ مَهِیْنٌ ۙ وَّلَا یَکَادُ یُبِیْنُ (۵۲)

اس آیت میں کلام کا ایک حصہ حذف ہے۔ پچھلی سورتوں میں متعدد مثالیں اس قسم کے استفہامیہ جملوں میں حذف کی گزر چکی ہیں۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ جب مصر کی بادشاہی، اس کے دریا اور نہریں میرے قبضہ میں ہیں تو یہ شخص بہتر ٹھہرا جو ایک غلام قوم کا فرد ہے اور اپنی بات کھول کر بیان بھی نہیں کر سکتا یا میں بہتر ہوں جو اس پورے ملک اور اس کی تمام دولت و ثروت کا بلا شرکت غیرے مالک ہوں! مطلب یہ کہ جب صورت حال یہ ہے تو آخر اس شخص میں ایسی کیا بات تھی کہ خدا نے اس کو رسول بنایا۔

'مَهِیْنٌ' سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ایک غلام قوم کے فرد ہیں اور 'لَا یَکَادُ یُبِیْنُ' سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوت بیانیہ کی کمزوری کی طرف اشارہ ہے۔ 'وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ' کے تحت ہم یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لکنت وغیرہ کی قسم کا کوئی عارضہ تو نہیں تھا، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے گمان کیا ہے، البتہ وہ کوئی زبان آور خطیب نہیں تھے اور اس دور میں کسی شخص کو پبلک میں نمایاں ہونے کے لیے ساحری، شاعری اور خطابت میں سے کسی نہ کسی ایک چیز میں ممتاز ہونا ضروری تھا۔ فرعون نے ان کی اس کمزوری کا بھی طعنہ دیا کہ ایک طرف

تو یہ ایک غلام قوم کا فرد، دوسری طرف خطابت پر قادر نہیں تو میرے مقابل میں ایک ایسا شخص سیادت کا مدعی کیسے ہو سکتا ہے؟

فَلَوْلَآ اُلْقِیَ عَلَیْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِیْنَ (۵۳)

یعنی اس کے زعم کے مطابق اگر کوئی خدا ہے اور اس نے اس کو رسول بنا کر بھیجا ہے تو ہونا یہ تھا کہ آسمان سے اس کی زینت کے لیے کنگن اتارے جاتے اور فرشتے پرے بنا بنا کر اس کے جلو میں چلتے لیکن یہ مدعی تو ہے خدا کے رسول ہونے کا اور اس کی کس مپرسی کا جو حال ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ غور کرو کہ کوئی خدا کا رسول ہوگا تو وہ اس حال میں کیوں آئے گا!

یہ امر ملحوظ رہے کہ اس عہد میں عام طور پر سلاطین، بالخصوص مصر اور ایران کے سلاطین، اظہار شان و شوکت کے لیے سونے کے کنگن پہنتے تھے اور فوجی دستوں کے جلو میں نکلنا تو جس طرح آج شکوہِ خسروی کے اظہار کے لیے ضروری ہے اسی طرح اس زمانے میں بھی اس کا اہتمام تھا۔

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهُ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ (۵۴)

'اِسْتَخَفَّ' ضد ہے 'اِسْتَثْقَلَ' کا۔ 'اِسْتِثْقَالٌ' کے معنی کسی چیز کو بھاری بھرکم، وزن دار اور گراں سمجھنے کے ہیں اس وجہ سے 'استخفاف' کے معنی کسی کو بے وزن، بے حقیقت اور بے حیثیت سمجھنے کے ہوں گے۔ 'اِسْتَخَفَّ قَوْمَهُ' کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے اپنی قوم کو بالکل سادہ لوح پا کر اس کو پُرفریب باتوں سے چٹکیوں میں اڑا دیا اور وہ بے وقوفوں کی طرح اس کے چکموں میں آگئی۔

انسان کے اندر وزن ایمان سے پیدا ہوتا ہے

'اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ' یعنی یہ لوگ خدا کے نافرمان اور اس کے ایمان سے محروم تھے اس وجہ سے بالکل بے وزن اور بے حقیقت تھے۔ اس طرح کے لوگ بڑی آسانی سے شیاطین کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور شیاطین ان کی ناکوں میں نکیل ڈال کر جدھر چاہتے ہیں لیے پھرتے ہیں۔ انسان کے اندر وزن اللہ تعالیٰ کے تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ پاسنگ اس کے پلڑے میں نہ ہو تو اس کی حیثیت خس و خاشاک کی ہے۔ ہوا کا معمولی جھونکا بھی اس کو اڑا لے جاتا ہے۔

فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِیْنَ (۵۵)

'اَسَفَهُ' کے معنی ہیں 'اَغْضَبَهُ' یعنی اس کو غضبناک کر دیا۔ فرمایا کہ جب انھوں نے اپنی ان حرکتوں سے ہمیں غصہ دلایا تو بالآخر ہم نے بھی ان سے انتقام لیا اور ان سب کو غرق کر دیا۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ فرعون نے حضرت موسیٰ کا تعاقب اپنی تمام عسکری طاقت اور اپنے جملہ اعیان و امراء کے ساتھ کیا تھا اس وجہ سے اس عذاب نے اس کی پوری جمعیت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِیْنَ (۵۶)

'سَلَف' کے اصل معنی گزرنے کے ہیں۔ یہیں سے یہ گزرے ہوئے لوگوں کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ 'سلف' اچھے بھی ہوسکتے ہیں، برے بھی۔ یہاں یہ برے معنوں میں ہے یعنی ہم نے ان کو اس طرح مٹایا کہ وہ ایک داستانِ ماضی اور ایک افسانۂ پارینہ بن کے رہ گئے۔ یہی حقیقت بعض مقامات میں جَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ' کے الفاظ سے بھی واضح فرمائی گئی ہے۔ یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ اگر تم نے بھی انہی کی روش اختیار کی تو انھیں کی طرح تمھارا نام بھی حاضر کی لوح سے مٹا دیا جائے گا، صرف ماضی کی ایک داستان بن کر رہ جاؤ گے۔

قریش کو تنبیہ

'وَمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ'۔ 'مثل' کے معنی مثال اور نمونہ کے ہیں۔ 'مثال' بھی اچھی اور بری دونوں ہوسکتی ہے۔ یہاں یہ برے مفہوم میں ہے اس وجہ سے اس کے معنی نمونۂ عبرت کے ہیں یعنی ہم نے ان کو دوسروں کے لیے ایک مثالِ عبرت بنا دیا کہ لوگ ان سے سبق حاصل کریں کہ خدا سے اکڑنے والوں کا انجام یہ ہوا کرتا ہے۔

۶۔ آگے آیات ۵۷ - ۶۵ کا مضمون

جس مقصد سے اوپر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشتیں سنائی گئی ہیں اسی مقصد کی تائید کے لیے آگے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت کا بھی ایک حصہ اجمالاً بیان ہوا ہے کہ انھوں نے بھی اللہ کی توحید ہی کی دعوت دی لیکن ان کی پیروی کے مدعی مبتدعین نے ان کی صریح تعلیمات کے خلاف بدعتیں ایجاد کر کے ان کو ابن اللہ بنا کر رکھ دیا۔

اس سرگزشت کا آغاز اس تمہید سے فرمایا ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام لیا جاتا ہے تو قریش کے جھگڑالو لوگ یہ فتنہ اٹھاتے ہیں کہ یہ شخص عیسیٰؑ کی تعریف کرتا ہے، حالانکہ عیسیٰؑ سے اچھے تو ہمارے ہی معبود ہیں کہ وہ فرشتے اور خدا کی بیٹیاں ہیں جب کہ عیسیٰ (علیہ السلام) مریم (علیہا السلام) کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے بیوقوف پیرؤوں پر یہ اثر ڈالنا چاہتے ہیں کہ قرآن جو ان کا ذکرِ خیر کرتا ہے تو گویا عیسائیوں کی طرح ان کو ابن اللہ تسلیم کر کے ان کی بندگی کی دعوت دیتا ہے حالانکہ قرآن ان کا ذکر اللہ کے ایک بندے اور اس کے ایک رسول کی حیثیت سے کرتا ہے کہ انھوں نے بھی اسی توحید کی دعوت دی جس کی دعوت تمام انبیاء نے دی لیکن یہ شریر اور مناظرہ باز لوگ سیدھی سادی باتوں کو بھی فتنہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۷ - ۶۵

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ﴿۵۷﴾

وَقَالُوٓا ءَأٰلِهَتُنَا خَيْرٌ أَمْ هُوَ ۚ مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ ﴿۵۸﴾ إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنَٰهُ مَثَلًا لِّبَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ ﴿۵۹﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنكُم مَّلَٰٓئِكَةً فِى ٱلْأَرْضِ يَخْلُفُونَ ﴿۶۰﴾ وَإِنَّهُۥ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَٱتَّبِعُونِ ۚ هَٰذَا صِرَٰطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿۶۱﴾ وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ ٱلشَّيْطَٰنُ ۖ إِنَّهُۥ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿۶۲﴾ وَلَمَّا جَآءَ عِيسَىٰ بِٱلْبَيِّنَٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُم بِٱلْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُم بَعْضَ ٱلَّذِى تَخْتَلِفُونَ فِيهِ ۖ فَٱتَّقُوا ٱللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿۶۳﴾ إِنَّ ٱللَّهَ هُوَ رَبِّى وَرَبُّكُمْ فَٱعْبُدُوهُ ۚ هَٰذَا صِرَٰطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿۶۴﴾ فَٱخْتَلَفَ ٱلْأَحْزَابُ مِنۢ بَيْنِهِمْ ۖ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ أَلِيمٍ ﴿۶۵﴾

ترجمہ آیات ۵۷-۶۵

اور جب ابن مریم کی مثال دی جاتی ہے تو تمہاری قوم کے لوگ اس پر چیخنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے معبود اچھے ہوئے یا وہ؟ یہ بات وہ محض کج بحثی کے لیے اٹھاتے ہیں بلکہ یہ ہیں ہی جھگڑالو لوگ۔ وہ تو بس ہمارا ایک بندہ تھا جس پر ہم نے اپنا فضل فرمایا اور بنی اسرائیل کے لیے اس کو ایک مثال بنایا اور اگر ہم چاہیں تو تمہارے اندر سے فرشتے بنا دیں جو زمین میں خلافت کریں۔ ۵۷-۶۰

اور بے شک وہ قیامت کی ایک بہت بڑی دلیل ہے تو اس میں شک نہ کرو اور میری پیروی کرو۔ یہی سیدھی راہ ہے اور شیطان تم کو اس سے روکنے نہ پائے

بے شک وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ ۶۱-۶۲

اور جب عیسیٰ کھلی نشانیوں کے ساتھ آیا تو اس نے دعوت دی کہ میں تمھارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں اور تاکہ میں تم پر واضح کر دوں بعض وہ باتیں جن میں تم نے اختلاف کیا ہے۔ تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ بے شک اللہ ہی میرا بھی رب ہے اور تمھارا بھی رب ہے تو اسی کی بندگی کرو۔ یہی سیدھی راہ ہے۔ تو ان کے اندر سے پارٹیوں نے اختلاف برپا کیے۔ پس ہلاکی ہو ان لوگوں کے لیے جنھوں نے شرک کا ارتکاب کیا، ایک دردناک دن کے عذاب کی۔ ۶۳-۶۵

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ ۝ وَقَالُوا أَآلِهَتُنَا خَيْرٌ أَمْ هُوَ مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ (۵۷-۵۸)

قریش کے شریروں کی ایک فتنہ انگیزی

یعنی جب تمھاری قوم کے سامنے انبیاء کے سلسلے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی دعوت کا بھی حوالہ دیا جاتا ہے کہ وہ بھی اسی دینِ توحید کے داعی بن کر آئے جس کی دعوت تمام انبیاء نے دی تو تمھاری قوم کے جھگڑالو مجرد ان کے نام کے ذکر ہی کو فتنہ بنا لیتے اور چیخنا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ لو، یہ شخص ہمارے بتوں کو تو برا کہتا ہے لیکن مسیح کی تعریف کرتا ہے۔ حالانکہ ہمارے معبود فرشتے ہیں اور مسیح بہرحال مریم کے بیٹے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے عوام کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ قرآن حضرت عیسیٰ کا ذکر کرتا ہے تو گویا ایک معبود کی حیثیت سے کرتا ہے اور یہ ایک سازش ہے اس غرض کے لیے کہ ہمارے ذہنوں سے ہمارے آبائی دیوتاؤں کی عقیدت ختم کر کے ان کی جگہ مسیح کی الوہیت کا عقیدہ راسخ کیا جائے۔

'مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ'۔ فرمایا کہ یہ شگوفہ انھوں نے محض بحث جدال کے لیے چھوڑا ہے ورنہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ قرآن حضرت مسیح کا ذکر کرتا ہے تو معبود کی حیثیت سے نہیں بلکہ اللہ کے ایک بندے اور ایک رسول کی حیثیت سے کرتا ہے کہ دوسرے نبیوں اور رسولوں کی طرح انھوں نے بھی خلق کو توحید ہی کی تعلیم دی۔ یہ سب جانتے ہوئے انھوں نے محض

اس لیے یہ فتنہ اٹھایا ہے کہ قرآن اور نبی کی مخالفت کے لیے کوئی بہانہ ان کو ملے اور وہ لوگوں کو بھڑکا سکیں کہ یہ شخص ہمارے آبائی دین کو مٹا کر ہمارے اوپر مسیحیت کو مسلط کرنا چاہتا ہے۔ فرمایا کہ یہ لوگ ہیں ہی جھگڑالو، یہ شاخسانہ انھوں نے اتفاق سے نہیں کھڑا کیا ہے بلکہ فتنہ پردازی و شر انگیزی ان کے قومی مزاج کی خصوصیت بن چکی ہے۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ قریش کے جھگڑالو لیڈروں نے اسی طرح کا فتنہ اسم 'رحمان' کی آڑ لے کر اٹھانے کی کوشش کی تھی جس کی وضاحت ہم سورۂ بنی اسرائیل کی آیت 'قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ......(۱۱۰)' کے تحت کر چکے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اللہ تعالیٰ کے اسم 'رحمان' سے قریش ناواقف نہیں تھے لیکن اس کا غالب استعمال چونکہ اہل کتاب، بالخصوص نصاریٰ کے ہاں تھا، اس وجہ سے انھوں نے اپنی قوم کو یہ کہہ کر بھڑکایا کہ یہ شخص دوسروں کے عقائد و نظریات ہمارے اوپر مسلط کرنا چاہتا ہے اور اس کے ثبوت میں انھوں نے دلیل یہ دی کہ جو صحیفہ یہ شخص پیش کر رہا ہے اس میں لفظ 'رحمان' کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح کی باتوں کی آڑ لے کر مشرکین یہ بھی کہتے تھے کہ اہل کتاب میں سے کچھ لوگ ہیں جو اس شخص کو سکھاتے ہیں اور مقصود اس سازش کا ہمارے دین اور ہماری روایات کو مٹانا ہے۔

بدگمانی کی فضا میں اس طرح کے اشتغلے بڑے کارگر ثابت ہوتے ہیں۔ عوام کے ذہن بالکل خام ہوتے ہیں۔ وہ بڑی آسانی سے اس طرح کی باتیں قبول کر لیتے ہیں اور جب قبول کر لیتے ہیں تو ان کو ذہنوں سے نکالنا آسان نہیں ہوتا۔

'صَدَّ مِنَ الشَّيْءِ' کے معنی ہوتے ہیں کسی شے سے بیزار ہو کر چیخ اٹھنا۔ کسی بات سے خوش ہو کر شور و غل کرنے کے لیے اس لفظ کا استعمال معروف نہیں ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۵۹)

حضرت عیسیٰؑ کی اصل حیثیت

یعنی قرآن ان کی مثال جو پیش کر رہا ہے تو ایک معبود کی حیثیت سے نہیں بلکہ صرف اس حیثیت سے پیش کر رہا ہے کہ وہ اللہ کے ایک بندے تھے جن پر اس نے اپنا خاص فضل فرمایا اور بنی اسرائیل کے لیے ان کو ایک نمونہ بنایا کہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ زندگی کی مثال یہ ہے۔ خاص فضل سے اشارہ ان خصوصیات کی طرف ہے جن کا ذکر قرآن کے دوسرے مقامات میں تفصیل سے ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بن باپ کے مجرد اپنے کلمۂ 'کُن' سے پیدا کیا، تائید روح القدس سے ان کو نوازا، ابھی وہ گہوارے ہی میں تھے کہ نہایت دانائی و حکمت کی باتیں کرنے لگے، پھر اللہ نے ان کو نبوت و رسالت کے منصب پر سرفراز فرمایا۔ انھوں نے لوگوں کو حکمت کی تعلیم دی۔ نہایت حیرت انگیز معجزے دکھائے اور یہود کی کوئی سازش ان کے خلاف اللہ تعالیٰ نے کامیاب نہیں ہونے دی۔ یہاں تک کہ یہود اپنے

جس کارنامے پر بہت نازاں ہیں کہ انھوں نے آنجنابؑ کو سولی پر چڑھا دیا، قرآن نے اس کی بھی تردید کر دی کہ اس سازش میں بھی وہ کامیاب نہیں ہوئے۔

بنی اسرائیل کے لیے مثال

مَثَلًا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ: یعنی اللہ تعالیٰ نے آں جنابؑ کو بنی اسرائیل کے لیے ایک نمونہ اور مثال بنایا کہ اس پاکیزہ مثال کو سامنے رکھ کر وہ اپنی زندگی کے تمام کج پیچ درست کر لیں۔ یوں تو ہر رسول اپنی قوم کی اصلاح کے لیے ایک خدائی کسوٹی ہوتا ہے اور اس کے اسوۂ حسنہ کی پیروی ہی میں قوم کی نجات مضمر ہوتی ہے لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص نوع کی ولادت اور نہایت کھلے ہوئے معجزات کے ساتھ اس لیے بھیجا کہ بنی اسرائیل جو اپنے انبیاء کی تمام تعلیمات بھلا کر بالکل اندھے بہرے بن گئے تھے آنکھیں کھولیں لیکن وہ ایسے قسی القلب نکلے کہ اس مثال سے بھی انھوں نے کوئی سبق حاصل نہیں کیا جس کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان پر ہمیشہ کے لیے لعنت کر دی۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِی الْاَرْضِ یَخْلُفُوْنَ (۶۰)

مشرکین کے ایک مغالطہ کا ازالہ

اوپر مشرکین کا قول نقل ہوا ہے کہ ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ (ہمارے معبود اچھے ہوئے یا وہ؟) یہ اسی پر استدراک ہے کہ تم نے اگر مجرد اس بنیاد پر فرشتوں کو معبود بنایا ہے کہ ان کی خلقت ایک اعلیٰ عنصر (نور) سے ہوئی ہے تو یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو کسی کو معبود بنا دینے کی دلیل بن سکے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا حال تو یہ ہے کہ وہ جس طرح فرشتوں کو نور سے بنا سکتا ہے اسی طرح چاہے تو وہ خود تمھارے اندر سے فرشتوں کی صفات کے لوگ پیدا کر دے اور وہ زمین میں خلافت کا وہ فرض انجام دیں جو انسانوں کو سپرد ہوا ہے لیکن یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے۔ اس وجہ سے اس نے ایسا نہیں کیا۔ مطلب یہ ہے کہ مجرد کسی کا نور یا نار سے پیدا ہونا یا کسی کا بن باپ کے وجود میں آنا اس کے خدا یا شریک خدا ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں یہ ساری باتیں ہیں اس وجہ سے مستحق عبادت وہی ہے جو اس ساری کائنات کا خالق ہے۔

وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (۶۱-۶۲)

حضرت عیسیٰؑ کے نشانِ قیامت ہونے کے بعض پہلو

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جھگڑنے والوں کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ بات کا بتنگڑ بنانے کی کوشش نہ کرو۔ حضرت عیسیٰؑ کو جس حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ وہ معبود یا ابن اللہ ہیں بلکہ وہ توحید کے داعی اور قیامت کا علم یعنی اس کی ایک قاطع حجت ہیں تو قیامت کے باب میں شک میں نہ پڑو اور مناظرہ بازی میں الجھنے اور الجھانے کے بجائے میری پیروی کرو۔ ہدایت اور فلاح کی سیدھی راہ یہی ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کے قیامت کی بہت بڑی حجت ہونے کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عام ضابطہ کے خلاف، ان کو بن باپ کے مجرد اپنے کلمۂ 'کن' سے پیدا کیا۔ مشرکین عرب کو قیامت کے باب میں سب سے بڑا شبہ یہی تھا کہ مرکھپ جانے کے بعد آخر لوگ قیامت کو کس طرح از سرِ نو پیدا ہو جائیں گے؟ قرآن نے ان کے اس شبہے کا ازالہ جگہ جگہ اس طرح فرمایا ہے کہ مرنے اور جینے میں اصلی دخل ظاہری اسباب کو نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیت کو ہے۔ یہاں اسی چیز کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ دیکھ لو، پیدائش کا عام ضابطہ تو یہ ہے کہ اولاد، باپ اور ماں دونوں کے جنسی تعلق سے پیدا ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو بن باپ کے صرف ماں سے پیدا کر دیا۔ اسی طرح وہ جب چاہے گا لوگوں کو ان کی قبروں سے اٹھا کھڑا کرے گا اور اس کو اس میں ذرا بھی زحمت پیش نہیں آئے گی۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں جو معجزے ظاہر ہوئے ان میں احیائے موتیٰ کے معجزے بھی ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مُردوں کو بھی زندہ کر دیتے اور مٹی سے پرندوں کی مانند مورتیں بنا کر ان میں بھی پھونک مار کر زندگی پیدا کر دیتے۔ ان کے اس قسم کے معجزات کا ذکر انجیلوں میں بھی ہے اور قرآن میں بھی ان کا حوالہ ہے۔ یہ معجزات اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھوں اس لیے ظاہر فرمائے کہ یہود قیامت کے باب میں جس بے یقینی میں مبتلا ہو گئے تھے اور جس کے سبب سے وہ بالکل دنیا کے کتے بن کر رہ گئے تھے، اس سے نکلیں اور از سرِ نو ایمان و ہدایت کی راہ اختیار کریں۔

تیسرا پہلو اس کا یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آسمان کی بادشاہی اور ابدی زندگی کی منادی جس شان سے کی ہے یہ بس انہی کا حصہ ہے۔ آدمی اگر انجیلوں میں ان کے وہ مواعظ پڑھے جن میں انھوں نے آخرت کی تذکیر فرمائی ہے تو آخرت کے خوف اور شوق دونوں سے دل لبریز ہو جاتا ہے بشرطیکہ دل پر یہود کی طرح سیاہی نہ چھا گئی ہو۔

آنحضرت صلعم کی زبان سے قریش کو تنبیہ

'فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُونِ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ'۔ یعنی اس قیامت کے باب میں کسی شک میں نہ پڑو اور میری پیروی کرو۔ میں جس توحید کی دعوت دے رہا ہوں اور جس روزِ جزا و سزا سے آگاہ کر رہا ہوں یہی زندگی کی صحیح اور سیدھی راہ ہے اس وجہ سے تمھاری فلاح میری پیروی ہی میں ہے۔ اس آیت میں لفظ 'اتَّبِعُوْنِ' (میری پیروی کرو) اس بات کی صاف دلیل ہے کہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قریش کو کہلائی گئی ہے۔ اگر بات براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہی گئی ہوتی تو لفظ 'اتَّبِعُوْنِ' موزوں نہ ہوتا۔ قرآن میں یہ لفظ جگہ جگہ اپنی مختلف شکلوں میں استعمال ہوا ہے لیکن کہیں بھی یہ اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال نہیں ہوا ہے۔ اگرچہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوائی گئی ہے تو آیت سے پہلے 'قُلْ' یا اس مفہوم کا کوئی اور لفظ آنا تھا لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ قرآن میں متعدد مثالیں موجود ہیں کہ اثنائے کلام میں کوئی بات حضرت جبریلؑ کی زبان سے یا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یا کسی اور قائل کی زبان سے کہلا دی گئی ہے اور اس کے ساتھ اس طرح کی کوئی تشریح نہیں ہے کہ قائل کون ہے۔ صرف قرینہ قائل کو معین کرتا ہے۔ یہاں لفظ 'اتَّبِعُوْنِ' اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ اس کے قائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہو سکتے ہیں اس وجہ سے اس کی تصریح کی ضرورت نہیں تھی۔

'وَلَا یَصُدَّنَّکُمُ الشَّیْطٰنُ ۚ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ' یہ اس تنبیہ کا حصہ ہے کہ اس امر کو کبھی نہ بھولو کہ شیطان اس صراط مستقیم کا کھلا ہوا دشمن ہے جس کی طرف میں بلا رہا ہوں۔ وہ صاف صاف اللہ تعالیٰ کو یہ چیلنج دے چکا ہے کہ 'لَاَقْعُدَنَّ لَھُمْ صِرَاطَکَ الْمُسْتَقِیْمَ' (الاعراف: ۱۶) (میں لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے ان کی گھات میں تیری سیدھی راہ پر بیٹھوں گا) مطلب یہ ہے کہ میری اس تنبیہ کے بعد بھی اگر تم ایک ایسے دشمن سے مار کھا گئے جس کی دشمنی ڈھکی چھپی نہیں ہے تو یہ تمھاری بدبختی کی انتہا ہوگی۔

وَلَمَّا جَآءَ عِیْسٰی بِالْبَیِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُکُمْ بِالْحِکْمَۃِ وَلِاُبَیِّنَ لَکُمْ بَعْضَ الَّذِیْ تَخْتَلِفُوْنَ فِیْہِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ (۶۳)

حضرت عیسیٰ کی بعثت کا مقصد

یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقصد بعثت اور ان کی دعوت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نہایت واضح نشانیوں کے ساتھ آئے اور بنی اسرائیل کو دعوت دی کہ میں تمھارے پاس کوئی نیا دین نہیں بلکہ وہی دین لے کر آیا ہوں جس کی تعلیم حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دی۔ البتہ حکمت دین، جس سے تم نے اپنے کو محروم کر لیا ہے وہ لے کر آیا ہوں تاکہ تم میں ایمانی زندگی پیدا ہو اور تاکہ بعض ان اختلافات میں امر حق واضح کر دوں جن میں تم مبتلا ہو گئے ہو۔ قرینہ دلیل ہے کہ 'وَلِاُبَیِّنَ' کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ ہم نے اس کی وضاحت کر دی ہے۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کسی نئی شریعت کے داعی نہیں تھے بلکہ وہ تورات ہی کے مصدق تھے البتہ انھوں نے حکمت یعنی روح دین اور مغز دین سے بنی اسرائیل کو آشنا کرنا چاہا لیکن انھوں نے اس کی کوئی قدر نہیں کی۔ بلکہ اپنی اسی ظاہر پرستی میں مبتلا رہے جس میں مبتلا تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اصل دین تو ان کے اندر سے غائب ہو گیا البتہ کچھ رسوم رہ گئے جن کو ادا کر کے وہ مطمئن ہو جاتے کہ اللہ اور اس کے دین کے تمام حقوق سے وہ سبکدوش ہو گئے۔

اختلافات کو رفع کرنے والی چیز حکمت ہے

اگر دین کی حکمت غائب ہو جائے، صرف رسوم اور الفاظ باقی رہ جائیں تو اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ دین کے اندر طرح طرح کے اختلافات اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جن کو دور کرنا ناممکن ہو جاتا

ہے۔ یہود بھی حکمتِ دین سے محروم ہو جانے کے بعد اسی فتنہ میں مبتلا ہو گئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تعلیمِ حکمت کے ذریعہ سے ان کے ان مذہبی اختلافات کو دور کرنا چاہا لیکن یہود نے اس حکمت کی قدر نہیں کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے اختلافات برابر بڑھتے ہی رہے یہاں تک کہ وہ اپنے اس انجام کو پہنچ گئے جو ان کی ان ناقدریوں کا لازمی نتیجہ تھا۔

إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ (۶۴)

حضرت عیسیٰؑ کی اصل دعوت توحید ہے

بعینہٖ یہی مضمون صرف ایک لفظ کے معمولی فرق کے ساتھ آلِ عمران آیت ۵۱ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم اس کی پوری وضاحت کر چکے ہیں۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل دعوت بیان ہوئی ہے کہ انھوں نے بھی دوسرے تمام نبیوں اور رسولوں کی طرح توحید ہی کی دعوت دی، اپنی یا کسی اور کی بندگی کی دعوت نہیں دی۔ آلِ عمران کی محولہ بالا آیت کے تحت ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ انجیلوں میں جو یہ آتا ہے کہ 'میرا باپ اور تمھارا باپ'، اسی کی تعبیر قرآن نے 'إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ' کے الفاظ سے فرمائی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو جس معنی میں اپنا باپ کہتے ہیں اسی معنی میں دوسروں کا باپ بھی کہتے تھے اور تنہا اسی کو سزاوارِ عبادت سمجھتے تھے۔ یہ حقیقت بھی آلِ عمران کی تفسیر میں واضح ہو چکی ہے کہ لفظ 'اَب' عبرانی میں 'باپ' کے معنی میں بھی آتا ہے اور 'رب' کے معنی میں بھی اور مشترک الفاظ کی طرح اس کا مفہوم موقع و محل سے معین ہوتا ہے۔

'هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ'۔ یعنی خدا تک پہنچنے کی سیدھی راہ یہی ہے۔ اگر کسی اور کو خدا کا شریک بنا دیا جائے تو یہ سیدھی راہ کج یا مسدود ہو جاتی ہے۔

فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِن بَيْنِهِمْ ۖ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ أَلِيمٍ (۶۵)

عیسائیوں کے باہمی اختلافات

یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعوت تو نہایت واضح اور قطعی الفاظ میں توحید کی دی لیکن ان کی امت کے اندر سے مختلف گروہوں نے مختلف مذہب اختیار کر لیے۔ ان اختلافات کی نوعیت اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد شمعون کے پیروؤں کے سوا دوسرے تمام فرقوں نے تثلیث اور کفارہ وغیرہ کے طریقے ایجاد کر کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمِ توحید کا بالکل خاتمہ کر دیا۔ موجودہ مسیحیت تمام تر پال (PAUL) کی بدعات کا مجموعہ ہے اور ان بدعات کی تعبیر میں بھی مختلف گروہ ہو گئے ہیں۔

'فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ أَلِيمٍ'۔ 'الَّذِينَ ظَلَمُوا' سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے شرک میں مبتلا ہو کر اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے۔ فرمایا کہ ان لوگوں کے لیے ایک دردناک دن کے عذاب کی ہلاکی ہے!

۸- آگے کا مضمون ـــــ آیات: ۶۶-۸۹

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں پہلے تو ایمان لانے والوں کے حسنِ انجام اور کفر کرنے والوں کے سوءِ انجام کی وضاحت فرمائی ہے اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے ان لوگوں سے اعراض کا حکم دیا ہے جو اللہ کی ہدایت کا مذاق اڑاتے اور اپنے انجام سے بے فکر رہے ہیں۔
آخر میں توحید کی پھر یاد دہانی کر دی ہے کہ جو لوگ شفاعتِ باطل کے بل پر آخرت سے بےخوف ہیں، وہ یاد رکھیں کہ اس دن ہر ایک کو سابقہ اللہ واحد ہی سے پیش آئے گا اور کسی کی سفارش کسی کے کچھ کام آنے والی نہیں بنے گی ـــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۶۶-۸۹ | ع ۶ ۱۱ ۱۲

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا
يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۶﴾ اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا
الْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۷﴾ يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ
تَحْزَنُوْنَ ﴿۶۸﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴿۶۹﴾
اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ﴿۷۰﴾ يُطَافُ
عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ ۚ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ
الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَتِلْكَ
الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۲﴾ لَكُمْ فِيْهَا
فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۳﴾ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ
جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿۷۵﴾
وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۶﴾ وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ
لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ﴿۷۷﴾ لَقَدْ جِئْنٰكُمْ
بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۸﴾ اَمْ اَبْرَمُوْٓا اَمْرًا

فَاِنَّا مُبۡرِمُوۡنَ ﴿۷۹﴾ اَمۡ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّا لَا نَسۡمَعُ سِرَّهُمۡ وَ
نَجۡوٰىهُمۡ ؕ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَیۡهِمۡ یَكۡتُبُوۡنَ ﴿۸۰﴾ قُلۡ اِنۡ
كَانَ لِلرَّحۡمٰنِ وَلَدٌ ۖۗ فَاَنَا اَوَّلُ الۡعٰبِدِیۡنَ ﴿۸۱﴾ سُبۡحٰنَ رَبِّ
السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ رَبِّ الۡعَرۡشِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ ﴿۸۲﴾ فَذَرۡهُمۡ
یَخُوۡضُوۡا وَیَلۡعَبُوۡا حَتّٰى یُلٰقُوۡا یَوۡمَهُمُ الَّذِیۡ یُوۡعَدُوۡنَ ﴿۸۳﴾
وَهُوَ الَّذِیۡ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِی الۡاَرۡضِ اِلٰهٌ ؕ وَهُوَ الۡحَكِیۡمُ
الۡعَلِیۡمُ ﴿۸۴﴾ وَتَبٰرَكَ الَّذِیۡ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ
وَمَا بَیۡنَهُمَا ۚ وَعِنۡدَهٗ عِلۡمُ السَّاعَةِ ۚ وَاِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۵﴾
وَلَا یَمۡلِكُ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنۡ
شَهِدَ بِالۡحَقِّ وَهُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۶﴾ وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ
خَلَقَهُمۡ لَیَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى یُؤۡفَكُوۡنَ ﴿۸۷﴾ وَقِیۡلِهٖ یٰرَبِّ اِنَّ
هٰۤؤُلَآءِ قَوۡمٌ لَّا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۸۸﴾ فَاصۡفَحۡ عَنۡهُمۡ وَقُلۡ سَلٰمٌ ؕ
فَسَوۡفَ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۹﴾

وقف لازم — ع ۲۲ ۱۳

ترجمہ آیات: ۶۶ - ۸۹

یہ لوگ تو بس قیامت ہی کے منتظر ہیں کہ وہ ان پر اچانک آ دھمکے اور انھیں
اس کی خبر بھی نہ ہو۔ اس دن تمام دوست ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے
بجز خدا ترسوں کے۔ ۶۶ - ۶۷

اے میرے بندو، اب تم پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ تم غمگین ہو گے۔ جو ایمان
لائے ہماری آیتوں پر اور فرماں بردار رہے۔ جنت میں داخل ہو جاؤ تم اور تمھارے

ہم عقیدہ، تم شاد کیے جاؤ گے۔ ان کے سامنے سونے کی طشتریاں اور سونے کے پیالے پیش کیے جائیں گے اور ان میں وہ چیزیں ہوں گی جو دلوں کو پسند اور آنکھوں کے لیے لذت بخش ہوں گی۔ اور تم اس میں ہمیشہ رہو گے اور یہ وہ جنت ہے جس کے تم وارث بنائے گئے اپنے اعمال کے صلے میں۔ اور تمھارے لیے اس میں بہت سے میوے ہوں گے جن میں سے تم کھاؤ گے۔ ۶۸ - ۷۳

بے شک مجرمین ہمیشہ عذاب دوزخ میں رہیں گے۔ وہ ان کے لیے ہلکا نہیں کیا جائے گا اور وہ اسی میں مایوس پڑے رہیں گے۔ اور یہ ہم نے ان کے اوپر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ اور وہ پکاریں گے کہ اے مالک! اب تمھارا رب ہمارا خاتمہ ہی کر دے۔ وہ جواب دے گا کہ تمھیں اسی حال میں رہنا ہے۔ ۷۴ - ۷۷

اور ہم تمھارے پاس حق لے کر آئے لیکن تمھاری اکثریت حق سے بیزار رہی۔ کیا انھوں نے کوئی قطعی فیصلہ کر لیا ہے تو ہم بھی ایک قطعی فیصلہ کر لیں گے۔ کیا ان کا گمان ہے کہ ہم ان کے رازوں اور ان کی سرگوشیوں کو نہیں سن رہے ہیں؟ ہاں، ہم سن رہے ہیں اور ہمارے فرستادے ان کے پاس لکھ رہے ہیں۔ ۷۸ - ۸۰

کہہ دو کہ اگر خدائے رحمان کے کوئی اولاد ہو تو سب سے پہلا اس کی عبادت کرنے والا میں ہوں گا۔ آسمانوں اور زمین کا خداوند، عرش کا مالک، ان باتوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ تو ان کو چھوڑ دو یہ لاالفضولی اور ہنسی مسخری کر لیں یہاں تک کہ وہ اس دن سے دوچار ہوں جس کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے۔ ۸۱ - ۸۳

اور وہی اکیلا آسمانوں میں بھی خداوند ہے اور وہی زمین میں بھی خداوند ہے اور وہی حقیقی حکیم و علیم ہے اور بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات، جس کے اختیار میں آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کی بادشاہی ہے اور اسی کے پاس قیامت کا علم ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ اور جن کو یہ اس کے علاوہ پکارتے ہیں وہ سفارش پر اختیار نہیں رکھیں گے مگر وہ جو حق کی گواہی دیں گے اور وہ جانتے بھی ہوں گے۔ اور اگر تم ان سے پوچھو کہ ان کو کس نے پیدا کیا تو وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے تو پھر کہاں بھٹک جاتے ہیں! اور حق کی گواہی دینے والوں کا قول یہ ہوگا کہ اے رب! یہ لوگ خود ایمان لانے والے نہ بنے۔ تو تم ان کو نظر انداز کرو اور کہو، اچھا میرا سلام لو۔ پس یہ عنقریب خود جان لیں گے۔ ۸۴-۸۹

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (۶۶)

اوپر کے دلائل بیان کرنے کے بعد یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ لوگ تمھاری بات جو نہیں سن رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی نگاہوں میں تمھاری تذکیر و موعظت کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ان کا رویّہ شاہد ہے کہ یہ لوگ متنبہ ہونے اور آخرت کے لیے کچھ کمائی کرنے کے بجائے چاہتے ہیں کہ قیامت ان کے اوپر اس طرح اچانک آ دھمکے کہ اس کی ان کو خبر بھی نہ ہو۔ اگر یہی چاہتے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ اللہ نے تو یہ چاہا تھا کہ اس ہولناک دن کے آنے سے پہلے پہلے یہ اس کے لیے کچھ کمائی کر لیتے لیکن یہ اس کا استقبال اچانک ہی کرنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے فکر مند ہونا بے سود ہے۔ اپنی اس بے فکری کا انجام یہ خود دیکھ لیں گے۔

اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ (۶۷)

روزِ قیامت کی نفسی نفسی

یعنی اس دنیا میں تو ان کو اپنے دوستوں، مددگاروں، اپنی قوم و قبیلہ اور اپنے شرکا و شفعاء پر بھروسا ہے اور اس بھروسے نے انھیں آخرت سے بالکل بے فکر کر رکھا ہے لیکن آگے جو دن

آنے والا ہے اس دن کوئی قریبی سے قریبی رشتہ دار اور عزیز سے عزیز دوست بھی کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں بنے گا بلکہ یہ سارے دوست آخرت میں باہمدگر دشمن بن جائیں گے کہ ان کی یہ باہمی دوستی ہی ان کے لیے اس ابدی تباہی کا موجب ہوئی۔ اگر یہ ایک دوسرے کی ہاں میں ہاں ملانے والے نہ ہوتے بلکہ اپنے خیر و شر پر آزادی و سنجیدگی سے غور کرتے تو نبی اور اس کے ساتھیوں کے کلمۂ خیر کی برکت سے محروم نہ رہتے۔ اس دن ہر شخص اپنی اس محرومی پر سر پیٹے گا اور اپنے ساتھی کو ملامت کرے گا لیکن یہ سارا نالہ و شیون بالکل بے سود ہوگا۔ پیچھے آیات ۳۶-۳۹ میں یہ مضمون نہایت اعمدہ اسلوب سے بیان ہو چکا ہے۔

'اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ' یعنی خدا کے باایمان اور متقی بندے اس انجام بد سے محفوظ رہیں گے۔ انھوں نے ایک دوسرے کو حق و عدل کی نصیحت کی اور اسی پر خود بھی عامل رہے اس وجہ سے قیامت کے دن وہ اپنی کامیابی پر شادماں ہوں گے اور اپنے ساتھیوں کا سلام و تحیت کے ساتھ خیر مقدم کریں گے۔

يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۝ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ (۶۸-۷۰)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے متقی بندوں کو مبارکباد

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان متقی بندوں کو مبارک باد دی جائے گی کہ اے میرے بندو! اب تم خوف اور حزن کے دارالابتلا سے نکل کر اس ابدی بادشاہی میں داخل ہو گئے جس میں نہ تم کو کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ تم کسی حزن میں مبتلا ہو گے۔ ہم دوسرے محل میں وضاحت کر چکے ہیں کہ 'خوف'، مستقبل کے خطرات کا ہوتا ہے اور 'حزن'، حاضر و ماضی کی ناکامیوں اور صدمات کا۔ جنت ایسی جگہ ہے جہاں اہل ایمان ان دونوں ہی چیزوں سے محفوظ ہوں گے اس وجہ سے جنت کی تعبیر کے لیے یہ ایک نہایت جامع اسلوب ہے۔

'اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ' یہ متقی بندوں کی وہ صفات بیان ہوئی ہیں جن کی بنا پر وہ اس اجرِ عظیم کے مستحق ہوں گے —— ان صفات کے بیان سے کلام بالکل مطابق حال ہو گیا ہے گویا اللہ تعالیٰ نے انگلی اٹھا کر اشارہ فرما دیا کہ اس مقام بلند کے حق دار وہی لوگ ہوں گے جو آج ہماری آیات پر ایمان لائے اور صدق دل سے ہمارے احکام پر عمل پیرا ہیں۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکل کر جو لوگ ایمان کے مدعی ہیں لیکن خلوص دل سے اس کے احکام پر عمل پیرا نہیں ہیں وہ اس بشارت کے اہل نہیں ہیں۔

'اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ'۔ 'حبر' کے معنی خوش اور شاد کرنے کے ہیں۔

لفظ 'ازواج' کی تحقیق

لفظ 'اَزْوَاج'، قرآن مجید میں بیویوں کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور بعض دوسرے معنوں میں

بھی، مثلاً نوع بنوع اور گوناگوں کے معنی ہیں۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے۔ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى (۵۳) (اور اس نے آسمان سے پانی اتارا، پس ہم نے اس سے اگائیں مختلف، نباتات کی نوع بنوع قسمیں)۔

اسی طرح یہ ہم مسلک وہم مشرب جماعتوں کے مفہوم میں بھی قرآن میں آیا ہے۔ مثلاً

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ .... (الحجر: ۸۸)	اور تم اپنی نگاہ ان چیزوں کی طرف نہ اٹھاؤ جن سے ہم نے ان کی بعض جماعتوں کو بہرہ مند کر رکھا ہے۔
اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ (الصّٰفّٰت: ۲۲)	جمع کرو ان لوگوں کو جنھوں نے شرک کیا اور ان کے ہم مشربوں کو اور ان چیزوں کو جن کی یہ عبادت کرتے رہے ہیں۔
وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً (الواقعۃ: ۷)	اور اس دن تم تین گروہوں میں تقسیم ہوگے۔

ان نظائر کی روشنی میں ہمارا خیال یہ ہے کہ آیت زیر بحث میں بھی لفظ 'ازواج' ہم مسلک و ہم عقیدہ جماعتوں کے مفہوم میں آیا ہے۔ ترجمہ میں ہم نے اسی مفہوم کا لحاظ رکھا ہے۔ اگرچہ مدارج ایمان و عمل کے اعتبار سے مختلف ہوں گے لیکن اللہ کے تمام باایمان بندے جنت کی نعمتوں سے محظوظ و مسرور ہوں گے۔ اوپر کفار کے ہم مشربوں اور ان کے دوستوں کا ذکر گزر چکا ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے۔ ان کے مقابل میں اہل ایمان کا حال بیان ہوا کہ وہ مسرور و شادکام کیے جائیں گے۔

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ ۚ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۷۱)

'صِحَاف' کے معنی طشتریوں کے ہیں، 'اکواب' کے معنی 'پیالوں' کے۔ لفظ 'ذہب' جس طرح 'صحاف' کے ساتھ آیا ہے اسی طرح 'اکواب' کے ساتھ بھی ہے لیکن تکرار سے بچنے کے لیے اس کو حذف فرما دیا ہے۔ ہم نے ترجمہ میں اس کو کھول دیا ہے۔ یعنی غلمانِ جنت ان کی تواضع و ضیافت کے لیے ان کے سامنے سونے کی طشتریاں اور جام لیے ہوئے ہر وقت گردش میں ہوں گے۔

'وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ'۔ ان طشتریوں اور پیالوں میں کھانے اور پینے کی وہ چیزیں ہوں گی جو دل پسند بھی ہوں گی اور باصرہ نواز بھی۔ بعض چیزیں ذائقہ کے لحاظ سے اچھی ہوتی ہیں لیکن دیکھنے میں اچھی نہیں لگتیں۔ اللہ تعالیٰ اہل جنت کی ضیافت ایسی

نعمتوں سے فرمائے گا جو کام و دہن کے لیے بھی لذت بخش ہوں گی اور نگاہوں کے لیے بھی۔

وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ اوپر کی بات غائب کے اسلوب میں فرمائی گئی ہے اور یہ حاضر کے اسلوب میں۔ اسلوب کی یہ تبدیلی التفاتِ خاص کی دلیل ہے۔ یعنی خاص اہتمام کے ساتھ اللہ تعالیٰ ان کو بشارت دے گا کہ اطمینان رکھو، یہ جو کچھ تمھیں حاصل ہوا ہے یہ کوئی وقتی عزت افزائی نہیں ہے بلکہ اب تم اسی جنت میں ہمیشہ رہو گے۔ کسی بڑی سے بڑی نعمت کے متعلق بھی اگر یہ اندیشہ ہو کہ یہ وقتی اور عارضی ہے تو یہ چیز سارے عیش کو مکدّر کر دیتی ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ اہلِ جنت کو یہ اطمینان دلا دے گا کہ اب بے غل و غش اس جنت سے فائدہ اٹھاؤ۔ اب کوئی تمھیں اس سے محروم نہیں کر سکتا۔

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۷۲)

جنت مجرد انعام کے طور پر نہیں بلکہ حق کے طور پر ملے گی

اوپر والی بشارت سے بھی بڑی بشارت اللہ تعالیٰ اہلِ جنت کو یہ دے گا کہ یہ جنت تمھارے اعمال کے صلہ میں تم کو عطا ہوئی ہے۔ یعنی یہ محض تم پر انعام نہیں بلکہ یہ تمھارا حق بھی ہے۔ اگر کوئی عزت افزائی بلا استحقاق ہو تو دل کو اس سے سچی خوشی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کے اس پہلو کو بھی ملحوظ رکھا ہے اس وجہ سے اس نے جنت کو مجرد فضل و احسان کے بجائے اہلِ جنت کا حق اور ان کی ان محنتوں کا ثمرہ قرار دیا ہے جو حق کی راہ میں انھوں نے دنیا کے اندر جھیلی ہیں۔

لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ (۷۳)

اوپر آیت ۷۱ میں اہلِ جنت کے ماکولات و مشروبات کا ذکر تھا۔ یہ ان کے تفکہات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی لطف اندوزی کے لیے بے شمار قسم کے میوے ہوں گے ان میں سے جس میوے سے چاہیں گے لطف اٹھائیں گے۔ اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہو گا کہ اس ذخیرے میں کوئی کمی ہو جائے گی۔

اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ (۷۴)

اہلِ دوزخ کے لیے ابدی مایوسی

متقی بندوں کے انجام کے ذکر کے بعد اب مجرموں کا انجام بیان ہو رہا ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ ہمیش دوزخ کے عذاب ہی میں رہیں گے۔ اس سے ان کو کبھی رہائی نہیں نصیب ہو گی۔

لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ (۷۵)

یہ عذاب ان پر اس طرح مسلط ہو گا کہ اس سے نجات پانا تو در کنار کبھی عارضی اور وقتی طور پر بھی نہ وہ ٹالا جائے گا اور نہ اس میں کوئی تخفیف ہی ہو گی۔ وَهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ۔ وہ اس میں بالکل مایوس ہوں گے۔ آخری درجے میں یہ موہوم امید بھی کبھی سہارا بن جاتی ہے کہ شاید اس عذاب سے کبھی رہائی حاصل ہو جائے یا کبھی اس میں کوئی تخفیف ہی ہو جائے لیکن ان بدبختوں کے لیے اس طرح کا کوئی موہوم سہارا بھی نہ ہو گا۔

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ (۷۶)

یعنی اس صورتِ حال سے ان کو جو سابقہ پیش آئے گا تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا بلکہ اس کے اسباب انھوں نے خود فراہم کیے اس وجہ سے وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنیں گے۔ ان کی ہدایت کے لیے جو اہتمام ضروری تھا وہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے فرمایا لیکن انھوں نے اس کی قدر نہیں کی بلکہ ساری زندگی اپنی خواہشوں کی غلامی میں گزاری جس کے نتیجہ میں اس انجام سے دوچار ہوئے۔

وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ (۷۷)

اہلِ دوزخ کی فریاد جہنم کے داروغہ سے اور اس کا جواب

آیت ۷۵ میں ان کی جس ابدی مایوسی کا ذکر ہے یہ اس کی وضاحت ہے کہ وہ دوزخ کے جیلر سے کہیں گے کہ اے مالک! اگر ہمارے لیے کسی رحم کی گنجائش نہیں رہی تو اپنے رب سے ہمارے لیے درخواست کرو کہ وہ ہمارا خاتمہ ہی کر دے۔ وہ فوراً جواب دے گا کہ تمھارا خاتمہ نہیں کیا جائے گا بلکہ تمھیں اسی حال میں پڑے رہنا ہے۔ مایوس کے لیے آخری سہارا موت کا سہارا ہوتا ہے لیکن یہ لوگ اس سہارے سے بھی محروم ہوں گے اور یہ ان کی سب سے بڑی محرومی ہوگی۔

لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ (۷۸)

قریش کو تنبیہ

مجرمین کا انجام سنانے کے بعد یہ پھر قریش کو تنبیہ ہے کہ ہم نے قرآن کی شکل میں تمھارے سامنے حق پیش کر دیا ہے لیکن تمھاری اکثریت کا حال یہ ہے کہ حق تمھیں بہت ناگوار ہے۔ اگر یہ ناگوار ہے تو اس کا جو انجام تمھارے سامنے آنے والا ہے اس کو اچھی طرح سوچ لو۔ اب اس انجام سے تم کو دوچار ہونا پڑا تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر ظلم نہیں ہوگا بلکہ تم خود اپنے اوپر ظلم ڈھانے والے ہو گے۔

اَمْ اَبْرَمُوْٓا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ (۷۹)

'ابرامٌ' کے معنی کسی امر کو محکم کرنے کے ہیں۔ 'ابرم الحبل' کے معنی ہوں گے رسی کو اچھی طرح مضبوط بٹنا۔ یہاں یہ کسی بات کا قطعی فیصلہ کر لینے کے مفہوم میں آیا ہے۔

قریش کو فیصلہ کن عذاب کی دھمکی

یہ قریش کو فیصلہ کن عذاب کی دھمکی دی ہے اور دھمکی میں شدت پیدا کرنے کے لیے اسلوب اچانک حاضر سے غائب کا اختیار کر لیا ہے گویا وہ لائق خطاب و التفات نہیں رہے۔ فرمایا کہ اگر انھوں نے ایک قطعی فیصلہ کر لیا ہے تو لازماً ہم بھی ایک قطعی فیصلہ کر لیں گے۔ یعنی انھوں نے اگر قرآن اور رسول کی تکذیب کا فیصلہ کر لیا ہے تو یاد رکھیں کہ اس کے بعد اپنی سنت کے مطابق ہم بھی ان کو ہلاک کر دینے کا فیصلہ کر لیں گے۔

رسولوں کے باب میں اس سنتِ الٰہی کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ گزر چکی ہے کہ جب

قوم رسول کے اخراج یا اس کے قتل کا فیصلہ کر لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو مزید مہلت نہیں دیتا بلکہ رسول اور اس کے باایمان ساتھیوں کو اپنی امان میں لے لیتا اور قوم کو ہلاک کر دیتا ہے۔ یہاں اسی سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے کہ اگر یہ لوگ رسول کی تکذیب کے معاملے میں یکسو ہو گئے ہیں تو اب لازماً یہ سنت الٰہی کی زد میں بھی آ جائیں گے اور کوئی چیز اس سے ان کو بچانے والی نہیں بنے گی۔ اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ قوم جب تک رسول کی دعوت کے باب میں مذبذب رہتی ہے اس وقت تک تو اللہ تعالیٰ اس کو مہلت دیتا ہے لیکن جب وہ داعی اور دعوت کو ختم کر دینے کا حتمی فیصلہ کر لیتی ہے تو اس کے باب میں خدا کا آخری فیصلہ بھی ظہور میں آ جاتا ہے۔

اَمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ ؕ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَیْهِمْ یَكْتُبُوْنَ (۸۰)

خفیہ سرگوشیوں کی طرف اشارہ

اللہ تعالیٰ یوں تو لوگوں کے ہر راز اور ان کی ہر سرگوشی کو جانتا ہے لیکن سیاق و سباقِ کلام یہاں دلیل ہے کہ اس سے خاص طور پر ان سرگوشیوں کی طرف اشارہ ہے جو قریش کے لیڈر دار الندوہ وغیرہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل یا اخراج سے متعلق کر رہے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اس مغالطہ میں نہ رہیں کہ خدا ان کی سازشوں اور سرگوشیوں سے بے خبر ہے۔ وہ ان کی تمام خفیہ حرکتوں سے اچھی طرح باخبر ہے اور اس کے فرشتے ان کی ایک ایک بات کا ریکارڈ رکھ رہے ہیں۔ یہ جس وقت پیغمبر کے باب میں اپنا آخری فیصلہ کر لیں گے خدا کا فیصلہ بھی ان کے باب میں ظہور میں آ جائے گا۔ پھر ان کے تمام منصوبے دھرے رہ جائیں گے اور خدا کا فیصلہ نافذ ہو جائے گا۔

قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِیْنَ ۝ سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا یَصِفُوْنَ (۸۱-۸۲)

ابتدائے سورہ کے مضمون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فیصلہ کن بات

یہ آخر میں، ابتدائے سورہ کی اس بحث کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے جو فرشتوں کی الوہیت کے ابطال میں گزر چکی ہے، ایک فیصلہ کن بات کا اعلان فرمایا کہ ان لوگوں کو بتا دو کہ اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ خدا کوئی اولاد بھی رکھتا ہے تو تم سے پہلے اس کی عبادت کے لیے میں خود تیار ہوں لیکن آسمانوں اور زمین اور عرش کا مالک ان باتوں سے پاک ہے جو یہ اس کی طرف بغیر کسی دلیل کے منسوب کر رہے ہیں۔ وہی تنہا ان تمام چیزوں کا خالق اور وہی اکیلا اس ساری کائنات کا مالک اور اس کے عرشِ حکومت پر بلا شرکت غیرے حکمران ہے۔ نہ وہ کسی بیٹے کا محتاج ہے، نہ کسی بیٹی کا اور نہ کسی معاون و شریک کار کا۔

فَذَرْهُمْ یَخُوْضُوْا وَیَلْعَبُوْا حَتّٰى یُلٰقُوْا یَوْمَهُمُ الَّذِیْ یُوْعَدُوْنَ (۸۳)

یعنی یہ فیصلہ کن چیلنج دے کر ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ جو باتیں یہ چاہیں بنا لیں اور جو ہنسی مسخری کرنی چاہیں کر لیں، یہاں تک کہ وہ دن ان کے سامنے آ جائے جس کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے۔

اس دن ان پر ساری حقیقت کھل جائے گی کہ جن کو انھوں نے خدا کی اولاد بنا کر پوجا وہ ان کے کچھ کام آنے والے نہیں بنے۔

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ (۸۴)

یعنی وہی تنہا آسمانوں کا بھی خداوند ہے اور وہی زمین کا بھی خداوند ہے اور تنہا اسی کا حکم ارادہ ان دونوں کے اندر کارفرما ہے۔ ان کا باہمی توافق دلیل ہے کہ یہ ایک ہی قادر و قیوم کی مشیت کے تحت کام کر رہے ہیں۔ اگر ان کے اندر متعدد ارادے کارفرما ہوتے تو یہ درہم برہم ہو کر رہ جاتے۔

'وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ' وہ حکیم و علیم ہے۔ نہ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی ہوتا اور نہ وہ اپنی معلومات کے لیے کسی کی مدد کا محتاج ہے اس وجہ سے شفاعتِ باطل کا عقیدہ جس کی آڑ میں مشرکین آخرت سے نچنت بیٹھے ہیں، بالکل بے سود ہے۔ یہ عقیدہ اس کی حکمت اور اس کے علم کی نفی ہے۔

وَتَبَارَكَ الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَعِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (۸۵)

'تَبَارَكَ' میں خدا کی عظمت کا پہلو بھی ہے اور اس کے سراپا خیر و برکت ہونے کا پہلو بھی۔ اس کے باعظمت اور بابرکت ہونے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اسی سے ڈرا بھی جائے اور اسی سے امید بھی رکھی جائے۔ وہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا بادشاہ ہے اس وجہ سے کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس کے سامنے دم مار سکے یا اس کی مشیت میں کوئی دخل اندازی کر سکے۔ ساتھ ہی وہ عظیم رحمت و برکت والا ہے اس وجہ سے وہ ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کے لیے اس کی رحمت مقتضی ہوگی۔ اس رحمت کے لیے بندے کسی اور کی سفارش کے محتاج نہیں ہیں۔

'وَعِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ' قیامت کی گھڑی کا صحیح علم صرف اسی کے پاس ہے۔ اگر پیغمبر اس کا وقت نہیں بتا سکتے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ آئے گی ہی نہیں۔ اس کا آنا برحق ہے اور یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رکھو کہ تم کو لوٹنا اسی کی طرف ہے اس کے سوا اس دن کوئی اور مرجع نہیں ہوگا کہ تم اس سے کوئی امید باندھو۔

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَن شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (۸۶)

یہ 'وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ' کی وضاحت ہے یعنی مشرکین اس وہم باطل میں مبتلا ہیں کہ ان کے مولیٰ و مرجع ان کے مزعومہ شرکا و شفعاء ہوں گے جو سفارش کر کے ان کو خدا سے چھڑا لیں گے۔ فرمایا کہ جن کو یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ شفاعت پر کوئی اختیار نہیں رکھیں گے۔ اس دن فیصلہ تمام تر اللہ کے اختیار میں ہوگا اور وہ بالکل حق کے مطابق فیصلہ فرمائے گا۔ 'وَاللَّهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ ۖ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ لَا يَقْضُونَ بِشَيْءٍ' (المومن: ۲۰) (اور اللہ بالکل حق کے مطابق فیصلہ فرمائے گا اور جن کو یہ خدا کے سوا

پکارتے ہیں وہ کسی بات کا بھی فیصلہ نہیں کریں گے)۔

جو گواہی دے گا سچی گواہی دے گا

'اِلَّا مَنْ شَہِدَ بِالْحَقِّ وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ' یہ استثنائے منقطع ہے۔ یعنی اس دن سفارش کا اختیار تو کسی کو بھی نہیں ہوگا البتہ اللہ تعالیٰ جن کو اجازت مرحمت فرمائے گا وہ حق بات کی گواہی دیں گے اور وہ گواہی اُسی بات کی ہوگی جس کو وہ جانتے ہوں گے۔ قرآن میں جگہ جگہ اس بات کی تصریح ہے کہ خدا کے سامنے سفارش کے لیے صرف وہ لوگ زبان کھولیں گے جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت مرحمت ہوگی اور اسی کے لیے زبان کھولیں گے جس کے باب میں ان کو اجازت ملے گی۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے: 'یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِیَ لَهٗ قَوْلًا' (۱۰۹) (اس دن شفاعت کسی کو کوئی نفع نہیں پہنچائے گی مگر جس کے لیے خدائے رحمان اجازت دے اور اس کے لیے کوئی بات کہنے کو پسند کرے)۔ اسی طرح اس بات کی بھی تصریح ہے کہ اس دن جو بھی بات کرے گا اوّل تو خدا کے اذن کے بعد ہی بات کرے گا۔ پھر وہ وہی بات زبان سے نکالے گا جو بالکل ٹھیک ہوگی۔ سورۂ نبا میں ہے: 'یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَّا یَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا' (۳۸) (اور جس دن جبریل اور فرشتے صف باندھ کر کھڑے ہوں گے، وہ نہیں بات کریں گے مگر جس کو خدائے رحمان اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے گا)۔ اسی طرح اس بات کی بھی تصریح ہے کہ خدا کے مقرب بندے بھی زبان سے صرف وہی بات نکالیں گے جو ان کے علم میں ہوگی، جو بات ان کے علم سے باہر ہوگی اس کے باب میں وہ زبان کھولنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ سورۂ مائدہ آیت ۱۱۷ میں حضرت عیسیٰؑ کا قول گزر چکا ہے کہ 'وَكُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ' (میں ان کے اوپر گواہ رہا جب تک ان کے اندر رہا)۔ یعنی میرے بعد انھوں نے کیا بنایا اس کی مجھے کچھ خبر نہیں، اس کو تو ہی جانتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی گواہی صرف اس دور سے متعلق ہوگی جو ان کے سامنے گزرا ہے۔ بعد کے ادوار کے لوگوں کے متعلق وہ کچھ نہیں کہیں گے اس لیے کہ ان کے حالات سے وہ ناواقف ہوں گے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰی یُؤْفَكُوْنَ (۸۷)

یہ مشرکین کے حال پر اظہارِ تعجب ہے کہ وہ اللہ کے مقابل میں دوسروں کو شفاعت کا مجاز سمجھتے ہیں۔ فرمایا کہ اگر تم ان سے یہ سوال کرو کہ ان کو کس نے پیدا کیا ہے تو اس کا جواب بہر شکل وہ یہی دیں گے کہ اللہ نے! اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد معلوم نہیں ان کی مت کہاں ماری جاتی ہے کہ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ ان کے مزعومہ معبودوں کو خدا کے ہاں تقرب کا وہ مقام حاصل ہے کہ وہ جس کو چاہیں گے خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے اور جس کو چاہیں گے اپنی سفارش سے اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ پر فائز کرا دیں گے۔

وَقِیْلِهٖ یٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا یُؤْمِنُوْنَ (۸۸)

'وَقِیْلِهٖ' کا معطوف علیہ

'وَقِیْلِهٖ' کا عطف اوپر والی آیت میں 'بِالْحَقِّ' پر ہے۔ یعنی وہ صرف حق بات کہیں گے

اور ان کی شہادت یہ ہوگی کہ اے رب! ان کے ایمان نہ لانے میں اصل قصور انہی کا ہے، یہ خود ایمان لانے والے نہیں تھے۔ بیچ کی آیت محض استدراک کے طور پر بطور جملہ معترضہ آگئی تھی اس وجہ سے معطوف اور معطوف علیہ میں کوئی معنوی بُعد نہیں پیدا ہوا۔ اس کی مثالیں اس کتاب میں پیچھے بھی گزر چکی ہیں اور آگے بھی آئیں گی۔

یہاں یہ امر واضح رہے کہ مشرکین قیامت کے دن اپنے جن مزعومہ شرکاء کو اپنی ضلالت کے لیے بطور عذر پیش کریں گے وہ شرکاء ان کے اس الزام کو ان کے منہ پر پھینک ماریں گے۔ مثلاً فرشتوں کے متعلق قرآن میں تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ یہ مشرکین مدعی ہیں کہ وہ تمہاری پرستش کرتے رہے ہیں تو کیا ان کی یہ بات صحیح ہے؟ فرشتے اس سوال کے جواب میں صاف اظہار براءت کریں گے کہ یہ خود اس ضلالت کے ذمہ دار ہیں، ان کی اس گمراہی سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ أَهَٰٓؤُلَآءِ إِيَّاكُمْ كَانُوا۟ يَعْبُدُونَ ۝ قَالُوا۟ سُبْحَٰنَكَ أَنتَ وَلِيُّنَا مِن دُونِهِم ۖ بَلْ كَانُوا۟ يَعْبُدُونَ ٱلْجِنَّ ۖ أَكْثَرُهُم بِهِم مُّؤْمِنُونَ ۝
(سبا: ۴۰-۴۱)

اور اس دن کا خیال کرو جس دن ان سب کو اکٹھا کرے گا پھر فرشتوں سے سوال کرے گا کہ کیا یہ لوگ تمہاری پرستش کرتے رہے ہیں؟ وہ جواب دیں گے کہ تو ہر عیب سے پاک ہے، تو ان کے مقابل میں ہمارا کارساز ہے، بلکہ یہ لوگ تو جنوں کو پوجتے رہے ہیں اور ان کی اکثریت انہی پر ایمان رکھنے والوں کی ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی شہادت حق ان الفاظ میں مذکور ہے۔

وَإِذْ قَالَ ٱللَّهُ يَٰعِيسَى ٱبْنَ مَرْيَمَ ءَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ ٱتَّخِذُونِى وَأُمِّىَ إِلَٰهَيْنِ مِن دُونِ ٱللَّهِ ۖ قَالَ سُبْحَٰنَكَ مَا يَكُونُ لِىٓ أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِى بِحَقٍّ ۚ إِن كُنتُ قُلْتُهُۥ فَقَدْ عَلِمْتَهُۥ ۚ
(المائدۃ: ۱۱۶)

جب اللہ پوچھے گا، اے عیسیٰ بن مریم! کیا تم نے لوگوں کو یہ حکم دیا کہ مجھ کو اور میری ماں کو اللہ کے سوا معبود بناؤ؟ وہ جواب دیں گے، تو پاک ہے! میرے لیے کس طرح ممکن تھا کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر میں نے اس طرح کی کوئی بات کہی تو تو اس کو جانتا ہی ہوگا۔

یہی حقیقت سورۂ احقاف میں یوں واضح فرمائی گئی ہے۔

وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّن يَدْعُوا۟ مِن

اور ان سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جو اللہ کے سوا

دُوْنِ اللّٰہِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَہٗٓ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ وَھُمْ عَنْ دُعَآئِہِمْ غٰفِلُوْنَ ہ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ کَانُوْا لَہُمْ اَعْدَآءً وَّکَانُوْا بِعِبَادَتِہِمْ کٰفِرِیْنَ (الاحقاف: ۵-۶)

ایسی چیزوں کو پکارتے ہیں جو ان کو قیامت تک جواب دینے والی نہیں ہیں اور وہ ان کی بندگی سے بالکل بے خبر ہیں اور جب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن بنیں گے اور ان کی بندگی کا انکار کریں گے۔

فَاصْفَحْ عَنْہُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ ط فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ (۸۹)

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہے کہ یہ لوگ، اگر اپنا آخری انجام ہی دیکھنے کے درپے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو اور ان سے اسی طرح درگزر کرو جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے درگزر کیا۔ 'سَلٰمٌ' یہاں 'وِدَاع' کے مفہوم میں ہے۔ 'فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ' یعنی جس انجام کے یہ منتظر ہیں اس کے ظاہر ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ وہ اس کو عنقریب دیکھ لیں گے۔

بتوفیقِ ایزدی ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ۔

رحمان آباد

۲۲- اپریل ۱۹۷۶ء

۲۱- ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ